انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ

جریدہ حیاتِ نو

مدیر مسئول: سید راشد حامدی —— مدیر: ابوالاعلیٰ سید سبحانی

جلد:۳، شمارہ:۲، اکتوبر ۲۰۱۸ء/ محرم الحرام۔صفر المظفر ۱۴۴۰ھ

مجلس ادارت

محمد اسماعیل فلاحی............نئی دہلی

زبیر ملک فلاحی............لکھنؤ

انیس احمد فلاحی............جامعۃ الفلاح

فی شمارہ:	اندرون ملک	۳۰/روپئے
	بیرون ملک	۵/امریکی ڈالر
سالانہ زرتعاون:	اندرون ملک	۳۰۰/روپئے
	بیرون ملک	۲۰/امریکی ڈالر
لائف ممبرشپ:	اندرون ملک	۵۰۰۰/روپئے
	بیرون ملک	۳۰۰/امریکی ڈالر

- رجسٹرڈ ڈاک سے رسالہ منگانے کی صورت میں رجسٹری خرچ بذمہ خریدار ہوگا۔
- مقالہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

Printed, Published & Owned by Sayyed Rashid Ali,F-9, Zeeshan Apartment, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025. **Printed at**: Ala Printing Press, 3636, Katra Dina Baig, Lal Kuan, Delhi-110006. **Published at**:F-9, Zeeshan Apartment, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025. **Editor: Abul Aala Sayyed**

نقوشِ حیات

اداریہ	ابوالاعلی سید سبحانی	۳
اردو تراجم قرآن پر ایک نظر (۳۴)	ڈاکٹر محی الدین غازی	۵
افادات جلیل احسن ندویؒ (۱۱)	ظفر احمد الاثری	۱۲
سیرت طیبہ میں سماجی انصاف	ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی	۱۹
اسلام پر ہونے والے اعتراضات اوران کا دفاع	محمد انس فلاحی سنبھلی	۳۸
ہجری تقویم۔ تاریخ اور اہمیت	سراج احمد برکت اللہ فلاحی	۴۳
یونیفارم سول کوڈ۔۔۔	جوہر جاوید گیاوی	۶۰
امتیازات کے چند امتیازی پہلو	سعید اختر اعظمی	۶۴
غزل سے غزل نامہ تک	سید راشد حامدی فلاحی	۶۸
معزز ڈاکٹر اور بے چارہ کسان!	ماسٹر شاہ عالم فلاحی	۷۷
نایاب خطوط	ادارہ	۸۲
شعر و نغمہ	شرکائے بزم	۸۶
تعارف و تبصرہ	محمد اسعد فلاحی	۹۰
جامعہ کے لیل و نہار	مصباح الباری فلاحی	۹۲
اخبار انجمن	ادارہ	۹۵

خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ

Zeeshan Apartment, F-9, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025

Email: jareedahayatenau@gmail.com

موبائل نمبر (مدیر مسئول): +91-9811126467

موبائل نمبر (مدیر): +91-9891051676

اداریہ

اپنی بات

سماجی تعلقات کی ایک اہم بنیاد فساد فی الارض کے خلاف مشترکہ جدوجہد ہے۔ یہ زمین اللہ کی ہے اور اس زمین کو اللہ رب العزت نے انسانوں کے لیے مسخر کیا ہے، اور یہ قیامت تک آنے والے انسانوں کے رہنے بسنے کے لیے واحد ٹھکانہ ہے۔

اللہ رب العزت کی اس نعمت کا تقاضا ہے کہ اس کا پورا پورا حق ادا کیا جائے، یعنی اس زمین اور اس زمین پر موجود اللہ رب العزت کی تمام نعمتوں کو صحیح طور سے استعمال کیا جائے۔ نیز اس زمین اور اس زمین پر موجود اللہ کی تمام نعمتوں کو ضائع ہونے یا فساد کا شکار ہونے سے بچایا جائے۔ یہ کچھ افراد کی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ اس زمین پر رہنے بسنے والے تمام ہی انسانوں کی بنیادی ذمہ داری ہے۔

قرآن مجید میں فساد فی الارض کی اصطلاح بار بار استعمال ہوئی ہے، فساد فی الارض کے سلسلے میں انسانوں کا کیا رویہ ہونا چاہیے، اس ضمن میں قرآن مجید بہت ہی زبردست رہنمائی پیش کرتا ہے۔ ڈاکٹر محی الدین غازی نے فساد فی الارض کے قرآنی استعمالات کے تعلق سے کافی اہم اور فکر انگیز بات لکھی ہے، لکھتے ہیں:

’’قرآن مجید مختلف اعمال اور رویوں کے لیے فساد فی الارض کا فقرہ استعمال کرتا ہے۔ قرآن مجید میں اس فقرہ کا بکثرت استعمال اسے ایک قرآنی اصطلاح کا درجہ دے دیتا ہے۔ یہ اصطلاح بڑی معنی خیز ہے۔ یہ زمین انسانوں کے لیے بنائی گئی ہے اور تا قیامت پیدا ہونے والے انسانوں کا واحد ٹھکانہ ہے، اگر کسی فرد یا گروہ کا رویہ اس ٹھکانے کو نقصان پہنچانے یا برباد کرنے کا سبب بنتا ہے تو اس کے خلاف سارے انسانوں کا اٹھ کھڑا ہونا عین تقاضائے عقل وفطرت ہے۔

کسی برائی کو فساد فی الارض کہہ کر قرآن مجید اس مسئلہ کو انسانوں کا ذاتی مسئلہ بنا دیتا ہے، کہ اسے حل کرنے کی ذمہ داری انہیں خود آگے بڑھ کر قبول کرنا چاہیے، کسی عمل کے فساد فی الارض ثابت ہو جانے کے بعد اس کے خلاف احتجاج ہر فرد کے اندر پیدا ہو جانا عین متوقع ہے، ماسوا اس کے جس کا اپنا مفاد اس فساد سے وابستہ ہو چکا ہو۔

یوں تو فساد فی الارض کا اطلاق ان ساری برائیوں پر ہوتا ہے جن کا ارتکاب کرۂ ارض پر کیا جائے، لیکن قرآن مجید کے استعمالات بتاتے ہیں کہ معاشی انحراف اور مالی جرائم سے اس لفظ کا گہرا تعلق ہے۔ غالباً اس لیے کہ زمین ان وسائل کا مخزن ومنبع ہے جن پر انسانی زندگی کی بقا کا انحصار ہے''۔

(معاشی مسائل اور قرآنی تعلیمات (مجموعہ مقالات سیمینار)، فساد فی الارض کا مالی اور معاشی پہلو، ڈاکٹر محی الدین غازی صفحہ ۸۴ تا ۱۰۱، ادارہ علوم القرآن، علی گڑھ ۲۰۱۱ء)

فساد فی الارض کی مختلف صورتیں اور مختلف درجات ہوسکتے ہیں، یہ کم درجے کا بھی ہوسکتا ہے اور بڑے درجے کا بھی ہوسکتا ہے۔ چھوٹی سطح پر بھی اس کا ارتکاب ہوسکتا ہے اور بڑی سطح پر بھی اس کا ارتکاب ممکن ہے، ہر صورت میں اس کا مقابلہ کرنا اس کائنات میں رہنے بسنے والے انسانوں کی ذمہ داری ہے۔

اس وقت عالمی سطح پر بھی اور ملکی سطح پر بھی بہت سے وہ مسائل مستقل زیر بحث ہیں جن کا تعلق اِس زمین سے ہے اور جن سے یکساں طور پر اِس زمین پر بسنے والے تمام ہی افراد متأثر ہو رہے ہیں، مثال کے طور پر ماحولیات سے متعلق مسائل ہیں جن سے ہوا، پانی، پہاڑ اور کھیتیاں سب کچھ بری طرح متأثر ہیں، اسی طرح عالمی سطح پر رائج مالیاتی نظام کا مسئلہ ہے، جو سماج کو غیر معمولی طور پر عدم توازن کا شکار بنائے ہوئے ہے، ان مسائل کا تعلق راست طور پر تمام ہی انسانی آبادیوں سے ہے، اور بلاتفریق رنگ ومذہب تمام ہی انسانی آبادیاں، کم یا زیادہ، اس سے متأثر ہو رہی ہیں، چنانچہ ان مسائل کے حل کے لیے جدوجہد کرنا اور ان کے سلسلے میں عوام کے درمیان بیداری لانا ازحد ضروری اور منصب خلافت کا لازمی تقاضا ہے۔

ابوالاعلی سید سبحانی

اردو تراجم قرآن پر ایک نظر (۳۴)

(مولانا محمد امانت اللہ اصلاحی کے افادات کی روشنی میں)

ڈاکٹر محی الدین غازی، ای میل:mohiuddin.ghazi@gmail.com

اس مضمون میں اس کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی کہ قرآن مجید کے ترجمہ کا اہم اور عظیم کام کرنے والوں کی تحسین میں کچھ رقم کیا جائے کہ اتنی عظیم خدمت مختلف شخصیات کے ذریعہ جس قدر ہمت واہتمام سے انجام دی گئی، وہ محتاج بیان وستائش نہیں ہے۔

پیش نظر تحریر میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن مجید کے ترجمہ کا کام بہت ضروری مگر نازک عمل ہے، اس میں غلطی کے امکانات کو کم سے کم کرتے رہنے کی مسلسل کوشش ضروری ہے، قرآن اللہ کا کلام ہے، تاہم اس کلام کا ترجمہ ایک انسانی کوشش ہوتی ہے، جس میں غلطیوں کا امکان ہمیشہ باقی رہتا ہے، اسی لئے جو ترجمہ جتنا زیادہ مشہور ومتداول ہے اس کا بار بار گہرائی اور باریک بینی سے جائزہ لیتے رہنا بھی اسی قدر زیادہ ضروری ہے۔ اس جائزہ میں نہ کسی طرح کا احترام مانع ہونا چاہئے اور نہ کوئی نسبت حائل ہونی چاہئے، راقم کی رائے میں ہونا تو یہ چاہئے کہ ترجمہ قرآن کا کام اجتماعی طور پر اکیڈمی کی سطح پر اور متعدد بار متعدد ماہرین لغت کی نظر سے گذرنے کے بعد قابل اشاعت سمجھا جائے، اور اشاعت کے بعد بھی نظر ثانی کا کام جاری رہے۔ لیکن بوجوہ تراجم قرآن کے ساتھ ایسا اہتمام نہیں ہوسکا۔ عام طور سے ہر ترجمہ قرآن ایک انفرادی کوشش رہی ہے، اور اس لئے غلطیوں کا امکان کسی نہ کسی حد تک ہر ترجمہ میں پایا جاتا ہے۔

لفظ ''دون'' عربی کے ان الفاظ میں سے ہے جن کے متعدد معانی ہوتے ہیں، اور سیاق وسباق کی روشنی میں مناسب ترین معنی اختیار کیا جاتا ہے۔ دون کا ایک معنی ''سوا'' ہوتا ہے، مندرجہ ذیل آیتوں میں مِن دُونِ اللّٰہ کا ترجمہ کرتے ہوئے دون کا یہی معنی زیادہ تر مترجمین نے اختیار کیا ہے، البتہ کچھ مترجمین نے ''سوا'' کے بجائے ''چھوڑ کر'' ترجمہ کیا۔ اول الذکر تعبیر زیادہ مناسب ہے کیونکہ اس میں وسعت زیادہ ہے، اس میں وہ لوگ بھی آجاتے ہیں جو اللہ کو معبود مانتے ہیں، اور اللہ کے سوا دوسرے معبود بھی بناتے ہیں، اور وہ لوگ بھی آجاتے ہیں جو اللہ کو معبود نہیں مانتے اور اللہ کو چھوڑ کر دوسرے معبود بناتے ہیں۔ جبکہ دوسری تعبیر میں صرف وہی لوگ آتے ہیں جو اللہ کو معبود نہ مان کر دوسروں کو معبود مانتے ہیں۔ اس فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل آیتوں کے ترجموں کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ دون کے اس استعمال کی قرآن مجید میں بہت زیادہ مثالیں ہیں، کچھ آیتیں ذیل میں ذکر کی گئی ہیں۔

(۱) قُلْ أَتَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللّٰہِ مَا لَا یَمْلِکُ لَکُمْ ضَرّاً وَلَا نَفْعاً۔ (المائدۃ:76)

''کہو کہ تم خدا کے سوا ایسی چیز کی کیوں پرستش کرتے ہو جس کو تمہارے نفع اور نقصان کا کچھ بھی اختیار نہیں'' (فتح محمد جالندھری)

''ان سے کہیئے! کیا تم اللہ کو چھوڑ کر اس کی عبادت کرتے ہو جو تمہیں نہ نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان'' (نجفی)

''آپ ان سے کہئے کہ کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ان کی عبادت کرتے ہو جو تمہارے لئے نفع اور نقصان کے مالک بھی نہیں ہیں'' (جوادی)

''اِن سے کہو، کیا تم اللہ کو چھوڑ کر اُس کی پرستش کرتے ہو جو نہ تمہارے لیے نقصان کا اختیار رکھتا ہے نہ نفع کا'' (سید مودودی)

(۲) قُلْ أَنَدْعُو مِن دُونِ اللّٰہِ مَا لَا یَنفَعُنَا وَلَا یَضُرُّنَا۔ (الأنعام:71)

''کہو۔ کیا ہم خدا کے سوا ایسی چیز کو پکاریں جو نہ ہمارا بھلا کرسکے نہ برا'' (فتح محمد جالندھری)

''ان سے پوچھو کیا ہم اللہ کو چھوڑ کر اُن کو پکاریں جو نہ ہمیں نفع دے سکتے ہیں نہ نقصان'' (سید مودودی)

''آپ کہہ دیجئے کہ ہم خدا کو چھوڑ کر ان کو پکاریں جو نہ فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان''

(جوادی)

''کہیے! کیا ہم اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکاریں جو نہ ہمیں نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان'' (نجفی)

(۳) وَالَّذِيْنَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُونَ شَيْئاً وَهُمْ يُخْلَقُونَ۔(النحل:20)

''اور جن لوگوں کو یہ خدا کے سوا پکارتے ہیں وہ کوئی چیز بھی تو نہیں بنا سکتے'' (فتح محمد جالندھری)

''اور وہ دوسری ہستیاں جنہیں اللہ کو چھوڑ کر لوگ پکارتے ہیں، وہ کسی چیز کی بھی خالق نہیں ہیں'' (سید مودودی)

''اور اس کے علاوہ جنہیں یہ مشرکین پکارتے ہیں وہ خود ہی مخلوق ہیں'' (جوادی)

''اور اللہ کو چھوڑ کر جن کو یہ (مشرک) لوگ پکارتے ہیں وہ کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتے'' (نجفی)

(۴) وَيَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقاً مِّنَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ شَيْئاً۔ (النحل:73)

''اور خدا کے سوا ایسوں کو پوجتے ہیں جو ان کو آسمانوں اور زمین میں روزی دینے کا ذرا بھی اختیار نہیں رکھتے'' (فتح محمد جالندھری، من کا ترجمہ ''سے'' ہونا چاہئے، یہاں من کا ترجمہ ''میں'' کر دیا گیا ہے۔)

''اور اللہ کو چھوڑ کر اُن کو پوجتے ہیں جن کے ہاتھ میں نہ آسمانوں سے انہیں کچھ بھی رزق دینا ہے نہ زمین سے'' (سید مودودی)

''اور یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر ان کی عبادت کرتے ہیں جو نہ آسمان و زمین میں کسی رزق کے مالک ہیں'' (جوادی)

''اور یہ اللہ کو چھوڑ کر ایسوں کی عبادت (پرستش) کرتے ہیں جو ان کو آسمان و زمین سے روزی پہنچانے کا کوئی اختیار نہیں رکھتے'' (نجفی)

(۵) وَأَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ۔(مریم:48)

''اور میں آپ لوگوں سے اور جن کو آپ خدا کے سوا پکارا کرتے ہیں ان سے کنارہ کرتا ہوں'' (فتح محمد جالندھری)

''میں آپ لوگوں کو بھی چھوڑتا ہوں اور اُن ہستیوں کو بھی جنہیں آپ لوگ خدا کو چھوڑ کر پکارا کرتے ہیں'' (سید مودودی)

''اور آپ کو آپ کے معبودوں سمیت چھوڑ کر الگ ہو جاؤں گا'' (جوادی، اس میں من دون اللہ کا ترجمہ چھوٹ گیا ہے)

''اور میں آپ لوگوں سے اور ان سے جنہیں آپ اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہیں کنارہ کرتا ہوں'' (نجفی)

(۶) وَاتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ آلِهَةً لِّيَكُونُوا لَهُمْ عِزًّا۔ (مریم:81)

''اور ان لوگوں نے خدا کے سوا اور معبود بنا لئے ہیں تا کہ وہ ان کے لئے (موجب عزت و) مدد ہوں'' (فتح محمد جالندھری)

''اِن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے کچھ خدا بنا رکھے ہیں تا کہ وہ اِن کے پشتیبان ہوں'' (سید مودودی)

''اور ان لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر بہت سے خدا بنا رکھے ہیں تا کہ وہ ان کیلئے عزت وقوت کا باعث ہوں'' (نجفی)

''اور ان لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر دوسرے خدا اختیار کر لئے ہیں تا کہ وہ ان کے لئے باعث عزّت بنیں'' (جوادی)

(۷) إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ۔ (الانبیاء:98)

''تم اور جن کی تم خدا کے سوا عبادت کرتے ہو دوزخ کا ایندھن ہوں گے'' (فتح محمد جالندھری)

''بے شک تم اور تمہارے وہ معبُود جنہیں تم پوجتے ہو، جہنّم کا ایندھن ہیں'' (سید مودودی، یہاں بھی من دون اللہ کا ترجمہ چھوٹ گیا ہے)

''بیشک تم اور وہ چیزیں جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے تھے جہنم کا ایندھن ہیں'' (محمد حسین نجفی)

''یاد رکھو کہ تم لوگ خود اور جن چیزوں کی تم پرستش کر رہے ہو سب کو جہنّم کا ایندھن بنایا جائے گا'' (جوادی)

(۸) إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ لَن يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوِ اجْتَمَعُوا لَهُ۔ (الحج:73)

''جن لوگوں کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی نہیں بنا سکتے اگرچہ اس کے لئے سب مجتمع ہو جائیں'' (جالندھری)

’’جن معبودوں کوتم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہووہ سب مل کر ایک مکھی بھی پیدا کرنا چاہیں تونہیں کر سکتے‘‘(سید مودودی)

’’یہ لوگ جنہیں تم خدا کو چھوڑ کر آواز دیتے ہو یہ سب مل بھی جائیں تو ایک مکھی نہیں پیدا کر سکتے ہیں‘‘(جوادی)

’’اللہ کو چھوڑ کر تم جن معبودوں کو پکارتے ہووہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے۔اگر چہ وہ سب کے سب اس کام کے لئے اکٹھے ہو جائیں‘‘(محمد حسین نجفی)

(۹) وَإِذْ قَالَ اللّٰهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ أَأَنتَ قُلتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلَـٰهَيْنِ مِن دُونِ اللّٰهِ۔(المائدۃ:116)

’’غرض جب (یہ احسانات یاد دلا کر) اللہ فرمائے گا کہ "اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوا مجھے اور میری ماں کو بھی خدا بنالو؟"(سید مودودی)

’’اور جب اللہ نے کہا کہ اے عیسٰی بن مریم کیا تم نے لوگوں سے یہ کہہ دیا ہے کہ اللہ کو چھوڑ کو مجھے اور میری ماں کو خدا مان لو‘‘(جوادی)

’’وہ وقت یاد کرو جب اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے عیسیٰ بن مریم کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ اللہ کو چھوڑ کر مجھے اور میری ماں کو خدا بنالو‘‘(نجفی)

آخر الذکر دونوں مترجمین نے یہاں بھی ’’چھوڑ کر‘‘ ترجمہ کیا ہے، جو عیسائیوں کی حد تک تو بالکل خلاف واقعہ ہے۔عیسی علیہ السلام کے بعد عیسائیوں نے اللہ کو چھوڑ کر انہیں اور ان کی ماں کو معبود نہیں بنایا، بلکہ اللہ کے ساتھ ان دونوں کو عبادت میں شریک کیا۔غالبا یہی وجہ ہے کہ صاحب تفہیم ایسے ہر مقام پر چھوڑ کر ترجمہ کرتے ہیں، لیکن اس مقام پر انہوں نے اپنے عام طریق سے ہٹ کر معروف ترجمہ اختیار کیا،صحیح بات یہ ہے کہ یہی ترجمہ ایسے باقی تمام مقامات پر بھی زیادہ مناسب ہے۔

(۱۴۷) من دون اللہ کا ایک اور ترجمہ

(۱) وَلَمْ تَكُن لَّهُ فِئَةٌ يَنصُرُونَهُ مِن دُونِ اللَّهِ وَمَا كَانَ مُنتَصِراً۔(الکہف:43)

’’نہ ہوا اللہ کو چھوڑ کر اس کے پاس کوئی جتھا کہ اس کی مدد کرتا، اور نہ کر سکا وہ آپ ہی اس آفت کا مقابلہ‘‘(سید مودودی)

’’(اس وقت) خدا کے سوا کوئی جماعت اس کی مددگار نہ ہوئی اور نہ وہ بدلہ لے سکا‘‘(فتح

محمد جالندھری)

''اس کی حمایت میں کوئی جماعت نہ اٹھی کہ اللہ سے اس کا کوئی بچاؤ کرتی اور نہ وہ خود ہی بدلہ لینے والا بن سکا'' (محمد جوناگڑھی)

''اب اس کے پاس کوئی ایسا گروہ بھی نہیں تھا جو اللہ کے مقابلہ میں اس کی مدد کرتا اور نہ ہی وہ غالب اور بدلہ لینے کے قابل تھا'' (نجفی)

(۲) فَمَا كَانَ لَهُ مِن فِئَةٍ يَنصُرُونَهُ مِن دُونِ اللَّهِ۔ (القصص:81)

''پھر کوئی اس کے حامیوں کا گروہ نہ تھا جو اللہ کے مقابلہ میں اس کی مدد کو آتا'' (سید مودودی)

''تو خدا کے سوا کوئی جماعت اس کی مددگار نہ ہو سکی'' (فتح محمد جالندھری)

''اور نہ کوئی گروہ خدا کے علاوہ بچانے والا پیدا ہوا'' (جوادی)

''اور اللہ کے سوا کوئی جماعت اس کی مدد کے لیے تیار نہ ہوئی'' (محمد جوناگڑھی)

''سو نہ اس کے حامیوں کی کوئی جماعت تھی جو اللہ کے مقابلہ میں اس کی مدد کرتی'' (نجفی)

(۳) مِمَّا خَطِيئَاتِهِمْ أُغْرِقُوا فَأُدْخِلُوا نَاراً فَلَمْ يَجِدُوا لَهُم مِّن دُونِ اللَّهِ أَنصَاراً۔ (نوح: 25)

''(آخر) وہ اپنے گناہوں کے سبب پہلے غرقاب کر دیئے گئے پھر آگ میں ڈال دیئے گئے۔ تو انہوں نے خدا کے سوا کسی کو اپنا مددگار نہ پایا'' (فتح محمد جالندھری، لفظ ''پہلے'' زائد ہے، آیت میں اس کے لئے کوئی لفظ نہیں ہے۔)

''اپنی خطاؤں کی بنا پر ہی وہ غرق کیے گئے اور آگ میں جھونک دیے گئے، پھر انہوں نے اپنے لیے اللہ سے بچانے والا کوئی مددگار نہ پایا'' (سید مودودی)

''اپنی کیسی خطاؤں پر ڈبوئے گئے پھر آگ میں داخل کیے گئے تو انہوں نے اللہ کے مقابل اپنا کوئی مددگار نہ پایا'' (احمد رضا خان، لفظ ''کیسے'' یہاں بے محل ہے)

''یہ لوگ بہ سبب اپنے گناہوں کے ڈبو دیئے گئے اور جہنم میں پہنچا دیئے گئے اور اللہ کے سوا اپنا کوئی مددگار انہوں نے نہ پایا'' (محمد جوناگڑھی)

''یہ سب اپنی غلطیوں کی بنا پر غرق کئے گئے ہیں اور پھر جہنّم میں داخل کر دیئے گئے ہیں اور خدا کے علاوہ انہیں کوئی مددگار نہیں ملا ہے'' (جوادی)

(۴)أَمَّنْ هَذَا الَّذِیْ هُوَ جُندٌ لَّكُمْ يَنصُرُكُم مِّن دُونِ الرَّحْمَنِ۔ (الملک:20)

''بتاؤ، آخر وہ کونسا لشکر تمہارے پاس ہے جو رحمان کے مقابلے میں تمہاری مدد کرسکتا ہے'' (سید مودودی)

''بھلا ایسا کون ہے جو تمہاری فوج ہو کر خدا کے سوا تمہاری مدد کر سکے'' (فتح محمد جالندھری)

''سوائے اللہ کے تمہارا وہ کون سا لشکر ہے جو تمہاری مدد کر سکے'' (محمد جونا گڑھی)

درج بالا آیتوں کے ترجموں پر نظر ڈالیں تو چار طرح کے ترجمے سامنے آتے ہیں، ''چھوڑ کر''، ''علاوہ''، ''سوا'' اور ''مقابلے میں''۔

بعض مترجمین جس طرح دوسرے مقامات پر سوا ترجمہ کرتے ہیں، یہاں بھی وہی ترجمہ کرتے ہیں، حالانکہ یہاں اس کا محل نہیں ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور نے مدد کی یا اللہ کے سوا کسی اور نے مدد نہیں کی، یہاں اللہ کے عذاب کا ذکر ہے، اللہ کی طرف سے مدد ہونے کی یا اللہ کے مددگار بننے کی بات نہیں ہے، ان آیتوں کا مدعا یہ ہے کہ اللہ کا عذاب آجانے پر اس عذاب سے بچانے والا اور اس عذاب کا مقابلہ کرنے والا کوئی مددگار نہیں ہوا۔

بعض مترجمین نے دوسرے مقامات کی طرح یہاں بھی ''چھوڑ کر'' ترجمہ کیا ہے، یہ ترجمہ بھی سیاق کے لحاظ سے موزوں نہیں ہے۔ اسی طرح ''علاوہ'' بھی برمحل نہیں ہے۔

مذکورہ تمام آیتوں میں دون کا ترجمہ کرنے کے لئے درست لفظ ''مقابلے میں'' یا اس کے ہم معنی الفاظ ہیں۔ کیونکہ ان آیتوں کا واضح مفہوم یہی ہے کہ اللہ کے عذاب کے مقابلے میں نہ وہ خود ڈٹ سکے، اور نہ کوئی ان کا مددگار ہوسکا۔

دیکھنے کی چیز یہ بھی ہے کہ بعض مترجمین ان یکساں اسلوب والی آیتوں کا الگ الگ ترجمہ کرتے ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان آیتوں کا ترجمہ کرتے وقت کسی ایک تعبیر کی طرف ان کا ذہن یکسو نہیں ہوسکا تھا، اور ان مختلف تعبیروں کے درمیان پایا جانے والا فرق ان کے سامنے کبھی رہا اور کبھی نہیں رہ سکا۔

افادات جلیل احسن ندویؒ (۱۱)

ظفر احمد الاثری، لندن، ای میل:asarizafar@hotmail.com

سورہ النحل (ب)

(آیت۷۶) گونگا، ضعف عقل اور غلام ہونے کی وجہ سے کچھ نہیں کرسکتا ہے۔اور ساری ذمہ داری مالک لیے ہوئے ہے اور اسے مالک جہاں کہیں بھیجے اس کام کو بجانہیں لاتا تو کیا جو انطق ہے، عدل پر ہے اور صحیح راہ پر ہے اور ہر کام بجالاتا ہے، دونوں برابر ہوسکتے ہیں۔

(آیت۷۷) معاد ہے، تمہاری نگاہوں سے اوجھل ہے وہ جانتا ہے، قیامت غیب میں ہے۔اس لیے وہ جانتا ہے کہ کب آئے گی۔البتہ جب آجائے گی تو اتنی سرعت سے آئے گی کہ جتنا آنکھ جھپکنے میں لگتا ہے۔بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

(آیت۷۸) اتنا مکرم بنایا لیکن تم لوگ ناشکری کررہے ہو۔

(آیت۷۹) وہ خدا کی قدرت سے اڑتی ہے، اپنی قدرت سے انھیں قوت دی ہے، وہ نشانی ہے کہ خدا کی قوت تسخیر ہے اور عذاب کی طرف اشارہ ہے، ویسے توحید کا ذکر ہورہا ہے۔

(آیت۸۰) **جعل لکم اثاثا، الی حین** [**اثاثا**] فرنیچر

[**مطلق**] مطلق سامان

[**سرابیل**] اورشیطان سے بچنے کے لیے بھی ایک سرابیل بنایا۔وہ کتاب الٰہی ہے، **یعنی کذلک یتم نعمته**، میں یہ بات مذکور ہے تاکہ تم لوگ ایمان لاؤ۔

(آیت۸۲) **فان تولوا عن هذه النعم، و هذه النعمة الکبری** ۔اس ہتھیار کو اور اس سرابیل کو نہیں پہن رہے ہیں تو ٹھیک ہے، آپ سے اس کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا۔

(آیت۸۳) پہچان کر انجان بن رہے ہیں۔

[**نعمة الله**] قرآن، ویسے عام ہے۔رسول کا رسول ہونا معلوم ہے لیکن اس سے انکار کررہے

ہیں۔

(آیت۸۴) [امۃ] کافرۃ مکذبۃ

[شھیداً] لیڈر، پھر پوچھا جائے گا لیکن کچھ نہ بن پڑے گا۔

[یستعتبون] خدا کی ناراضی کو دور کرنے کے لیے موقع مانگیں گے۔ لیکن نہیں دیا جائے گا۔ و لا یمھلون.

(آیت۸۵) تو وہ روئیں گے۔ یجرؤن ان یخفف و ان ینظروا، لکن...

(آیت۸۶) انھیں سزا دیجیے، یہ لوگ سزا کے لائق ہیں، تو فوراً جواب دیں گے کہ ہم کو تم لوگ نہیں پکارتے تھے۔

(آیت۸۷) ساری ہیکڑی بھول جائے گی۔

(آیت۸۸) شھداء علی، گواہ بنانا۔ مشرکین کے خلاف گواہی دی جارہی ہے، ان ہی میں سے اٹھے گا اور گواہی دے گا۔

انھم قوم لا یؤمنون یعنی رسول کو ان کے بارے میں گواہ بنا کر لائیں گے

"ھؤلاء" سے مراد مشرکین ہیں، انذار کا موقع ہے۔

[و نزلنا] گواہی کس بنیاد پر دلوائیں گے وہ کتاب کی بنیاد پر ہوگا۔

[تبیاناً] مبینا جو ہر طرح کے احکام کو بیان کر رہا ہے۔ تاریکیاں چھاٹ دیں۔

[مسلمین] وہ شخص جو کتاب اور نبی پر ایمان لایا، سورہ آل عمران کا موضوع ہی اسلام ہے۔

(آیت۹۰) تعلیمات کا نچوڑ بیان ہو رہا ہے۔ تمام آسمانی کتب اور صحیفہ ابراہیمی کا بھی یہی موضوع تھا۔ عدل، توحید، احسان، ماں کے ساتھ ہوگا۔ یہ آیت پورے دین کو سمیٹتی ہے

[ایتاء ذی القربی] صلہ رحمی کی تعلیم دی۔

عدل کے مقابلہ میں البغی آیا ہے، منکر کے مقابلہ میں ایتاء ذی القربی آیا ہے. فحشاء کے مقابلہ میں احسان آیا ہے۔

مشرکین سے خطاب ہے۔ دین ابراہیمی کی بنیاد یہی ہے۔ تم جو کہتے ہو کہ دین ابراہیمی وہ ہے جس پر تم قائم ہو وہ غلط ہے۔

(آیت۹۱) یہود، اہل کتاب۔ [اذا] اس نبی کی پیشین گوئی اس کتاب میں موجود ہے اور یہ عہد

لے لیا گیا تھا کہ جب وہ نبی آئے گا تو تمہیں اس کی مدد کرنی ہوگی۔لیکن نسلی تعصب کی بنیاد پر انکار کر رہے ہیں،انھوں نے عہد کیا ہے اور اس میں جتنے نبی آئے اس عہد کو دہراتے رہے۔ جتنے ذیلی انبیاء آئے سب نے دہرایا۔

[الایـــمـــان] معاہدہ،اس نبی اور اس کتاب سے معاہدہ خصوصیت سے، ویسے تو ان سے بہت معاہدے کیے گئے ہیں۔اللہ کو گواہ بنایا۔

[ان] اس وقت اللہ کے عہد کو پس پشت ڈال دیا ہے، نبی کو جھٹلا رہے ہیں۔مشرکین کے ساتھ ساز باز کر رہے ہیں۔

(آیت۹۲)**نکث** ٹکڑا، [**غزل**،] بٹا ہوا، **غزلها انکاثا من بعدما کانت قوة تتخذون**، اس وقت جو حرکت کر رہے ہیں اس کا ذکر ہے۔

[**دخلاً**] فساد ڈالنے کا ذریعہ بنا رہے ہو۔

[**ایمان**] موجود لوگ جو قسم کھا کر کہہ رہے ہیں کہ یہ نبی نہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کہیں اسماعیلی گروہ بنی اسرائیل سے آگے نہ بڑھ جائے۔

[**کراهية أن تكون**] [**امة**] **اسماعلية ، أربى من امة اسرائيلة** ،ہم سے فوقیت لے جائیں گے،اس لیے مخالفت کر رہے ہیں، یہ خدشہ تمہیں لگا ہوا ہے۔نبوت کے اوپر خاک ڈالنا چاہتے ہو،شہادت کو پس پشت ڈالتے ہو۔

[**انـــمـــا**] دیکھو اے یہود،تمہیں اس قرآن کے ذریعہ آزمایا جا رہا ہے، بنی اسماعیل میں نبی بھیج کر تمہیں آزما رہا ہے۔

(آیت۹۲)[**لیبیـــن**] اختلاف کو نہیں مان رہے ہو تو قیامت کے دن سب کچھ کھول کھول کر رکھ دیں گے۔جن جن چیزوں میں یہ بٹے ہوئے ہیں۔

(آیت۹۳) **لو شاء الله، قانون الجبر** یہ یہود سے خطاب ہے یعنی تم کو بالکل مجبور کر دیتا کہ تم ایمان لاؤ لیکن آزادی دے دی ہے اس لیے تم اس امتحان میں فیل ہو رہے ہو۔اور تم جان بوجھ کر ضلالت کی راہ اختیار کر رہے ہو،اس لیے راہ ہدایت کیسے کھلے گی۔مکی سورتوں میں ان کا ذکر اس لیے ہے کہ یہود کی مکہ میں کوٹھیاں تھیں، برابر ان کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔مشرکین کو اس نبی کے خلاف مشورہ دیا کرتے تھے۔

اس وقت پردہ میں ہیں اس لیے پردہ میں بات ہورہی ہے۔

(آیت۹۴) یعنی اہل ایمان میں یہ لوگ پروپیگنڈہ کررہے ہیں، ہوسکتا ہے کہ تمہارے ایمان کی وجہ سے ایمان لانے والوں کے باوجود اس کی طرف مائل ہیں، ان کا پاؤں پھسل جائے تو تم اس کا عذاب چکھو گے اس کے نتیجے میں۔ اس لیے اس سے بچو۔

[**ولکم**] یہ کام کرتے ہوا ایسا ہوگا۔

(آیت۹۵) عہد اللہ کو کیوں پس پشت ڈال رہے ہو۔ دنیا کی وجہ سے ایسا کیا ہے، یہ لوگ مذہبی اور سیاسی لوگ ہیں، اگر نبی پر ایمان لے آئیں گے اس کے پیروکار بن جائیں گے۔ اس لیے ساری قیادت اور سیادت خطرہ میں پڑ جائے گی۔

[**انما**] میں ما موصولہ ہے، **ان ما هو عند الله** ۔ دنیا کے مال ومتاع سے وہ بہتر ہے، جو اللہ کے پاس ہے، اس نبی پر ایمان لائے تو نعم سرمدی ملے گی (آیت۹۶) اگر صالح بن جاؤ گے تو وہ اصل ہے۔

[**ولنجزین**] یہ ڈیڑھ آیتیں تبشیر کی ہیں، حسن عمل کی وجہ سے بدلہ ملے گا۔

(آیت۹۷) صالحات کی جو فہرست ہے اس پر عمل کرو گے تو دنیا وآخرت میں بہترین زندگی بخشیں گے، ہجرت کرنے کے بعد یہ دنیا میں ملے گا۔

(آیت ۹۸) اہل ایمان کو ہدایت دی جارہی ہے، یہود اشتعال انگیزی کریں گے تو تم ایسا نہ کرنا، اس لیے کہ وہ شیطان رجیم کا کام ہے۔

(آیت۹۹) متوکل بندوں پر اس کا زور نہیں چلتا۔

(آیت۹۸۔۹۹) اگلی آیت کے لیے تمہید بنائی گئی ہے۔

(آیت۱۰۱) [آیة] حکم، تورات کا حکم بدل کر دوسرا حکم قرآن میں لاتے ہیں، یعنی ایک حکم لاتے ہیں جو تورات سے بدلا ہوتا ہے۔

[واللہ] یہ جملہ معترضہ ہے وہ حکم کیوں نازل ہورہا ہے اسے جانتا ہے۔ دو ہی وجہ سے احکام نازل ہوئے ہیں (۱) فقہائے یہود نے تحریفات کیں اسے بدل دیا، اور تشدد کا راستہ اپنایا تو نبی انھیں درست کر رہا ہے۔ (۲) جب بغی کرنے لگے تو ان پر گرفت کرنے لیے سخت احکام نافذ کردیا گیا لیکن یہ نبی جب آیا تو اس نے ان احکام کو ہلکا کیا۔

[قالوا] اس پر یہود کہتے ہیں کہ ہمارے انبیائی مسلک کے خلاف کرتے ہو، ہمارے دین میں یہ چیز حلال ہے لیکن تم نے اسے حرام کردیا اور حرام کو حلال کردیا۔

[بل] نبی نے ایسا نہیں کیا بلکہ اللہ نے کیا۔اوران کی اکثریت جذبات میں ہے۔

(آیت۱۰۲) حــق ،قــول فیـصــل ۔یہی ٹھیک ہے،تورات میں جو حکم ہے وہ بدعات ہیں [لیثبت] یہ حکم اس لیے نازل ہوا کہ مومنین کو تثبیت قلب حاصل ہو۔

[الذین آمنوا] بنی اسماعیل اور مسلمین سے مراد،صلحاء بنی اسرائیل۔

(آیت۱۰۳)[یقولون] متحدہ محاذ،خدا کی طرف سے وحی نہیں آئی، بلکہ اہل کتاب جو کتاب سے واقف ہیں وہ سکھاتے ہیں۔اس کا جواب دیا جارہا ہے۔

[ھذا] قرآن، یہ عربی اور تورات عجمی یعنی عبرانی زبان میں ہے۔

[لسان] الکتاب الذی، ھذا الکتاب[لسان الذی یلحدون]

(آیت۱۰۴)[آیات]،اپنی کتاب پر، یہود سے خطاب ہے،یا قرآن کی آیت۔

(آیت۱۰۵) میثاق باندھا لیکن اس کا انکار کررہے ہیں۔

(آیــت ۲)[اکــرہ] مجبور کیے گئے،حالات کے دباؤ میں ایمان لائے،لیکن یہودیوں نے کفر بلوایا تو ان کے لیے یہ سزائیں ہیں۔

[اکرہ] مجبور کیے گئے لیکن ان کا دل اس پر مطمئن رہا۔وہ کبھی کفر کی طرف مائل نہیں ہوئے دوسرا مطلب یہ کہ [قلبہ] لم یکفر من بعدہ.

(آیت۱۰۷)غضب کیوں بھڑکا، کیوں کفر کیا۔

[استحبوا] استحب ، احبہ جیداً

(آیت۱۰۹)مستمر فی الغفلة

(آیت۱۱۰) مخالفین حق کے مقابلے میں ہجرت کریں گے۔یہ تبشیر ہے۔[جــاھــدوا] ہجرت کے بعد بھی پورا پورا زور دین پر رہا۔[ھا] خصائل حمیدہ۔

(آیت۱۱۱) صرف اپنے بارے میں چاہے گا کہ عذاب سے بچ جاؤں، کسی اور کی طرف سے مجادلہ نہیں کرے گا۔لیکن یہ نافع نہیں ہوگا۔آخرت میں جو حشر ہوگا۔

(آیت۱۱۲)قریةً بدل ہے مثلاً سے۔

[آمنة] دنیاوی اور معاشی لحاظ سے فارغ تھی۔ جب ناشکری کی تو بھوک مسلط کر دی۔ اور خوف کا لباس مسلط کر دیا۔

(آیت ۱۱۳) کیا کرتوت اور کیوں سزا دی اس میں بیان ہوا۔

(آیت ۱۱۴) یہ نبی احکام دے رہا ہے۔ اور نصاری اور یہود کی فقہ کے خلاف پڑ رہا ہے۔ اور یہ احکام اس لیے دیے جا رہے ہیں کہ اس دین کو مانو اور یہ تمہارے لیے حلال ہیں۔ [اشکروا] توحید اختیار کرو۔ مومنین کو خطاب کیا جا رہا ہے۔ اس لیے کہ ان کے پروپیگنڈے سے متأثر ہو رہے ہیں۔ اور انہیں پکڑ رہے ہیں کہ اگر خدا کی عبادت کرتے ہو تو اس نبی کی بات سنو۔

(آیت ۱۱۵) مشرکین عرب یہ حلال سمجھتے تھے

[وما] اور جانور جو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔

[من] جو مرنے کے قریب ہو اور اپنی جان کا خطرہ ہو، تو کھا سکتا ہے اور وہ بھی زیادہ نہ کھائے اور اسے کھانے کی خواہش بھی نہ ہو۔ ولا عاد فی الاکل۔ ایسے میں کوئی الزام نہیں ہوگا۔ اور کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا۔

(آیت ۱۱۶) یہ آیت بتلاتی ہے کہ اوپر کی آیت یہود سے متعلق ہے۔ اشیاء کے بارے میں نہ کہو کہ یہ حرام ہیں اور یہ حلال ہیں۔ یہ جو تم نے بنا رکھا ہے یا تمام دین کے خلاف ہے اور یہ شریعتیں جن کو تم نے حلال کر لی ہیں۔

[یفترون] دین ابرہیمی اور دین موسوی بناتے تھے۔

(آیت ۱۱۷) [قلیل]. حقیر اور تنوین یختص.

(آیت ۱۱۸) اوپر کا خطاب مشرکین سے ہے۔

[ما قصصنا علیک] سورہ انعام ۱۴۶ میں ذکر ہے۔ ان تمام بدعات کی وجہ سے وہ نبی کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اغلال کو اتار رہا ہے تو یہ سوچ رہے ہیں۔

(آیت ۱۱۹) [ثم] صرف سزا دے ہی نہ دے گا اور کامیاب ہی سے نہیں ہمکنار کرے گا، بلکہ جن لوگوں نے ناواقفیت کی وجہ سے میری نافرمانی کی ہوگی، یعنی مومنین ان کو رحمت و مغفرت حاصل ہوگی۔

(آیت ۱۲۰) مشرکین عرب اور تمام لوگ رشتہ حضرت ابراہیم تک جوڑتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ دین ابراہیمی ہے۔

[امة]اطاعت،[قانتا لله]،وفادارتھا۔اس کے لیےاردو میں کوئی لفظ نہیں ہے۔

[حنیفا] **منقطعا الی الله**۔موحد تھے۔

(آیت۱۲۱) وہ شرک کے راستے میں نہیں بھٹکتے تھے، وہ برگزیدہ نبی تھے، ان کا دین وہی تھا جو سبھوں کا تھا۔

(آیت۱۲۲)[حسنة]ہجرت کے بعد بہت ہی مال ودولت دیا تھا، پورے عرب کے وہی فرمانروا تھے،اگرمشرک ہوتے تو صالحین میں کیسے ہوتے۔

(آیت۱۲۳) یہ نبی دین ابراہیمی لےکرآیا ہے،تم دین ابراہیمی پرنہیں ہو۔تم اسے کھو چکے ہو۔

[ملة]عقیدۃ۔

(آیت۱۲۴) یہود کی طرف سے پورے زورشور کے ساتھ اعتراض کیا جارہا ہے کہ تمام نبیوں میں ''سبــــــت'' کادن تھا۔اس کا جواب دیا جارہا ہے۔اعتراض کرنے کے لیے معقول اعتراض کرنا چاہیے،یعنی یہ کہ تم لوگوں پر واجب کیا گیا تھا تو کیا تم اسے پورا کرتے ہو۔ یہودی سا ہوکار کبھی بھی سبت نہیں مناتے تھے۔

[**اختلفوا**] اس سے ہٹے ہوئے لوگوں پرفرض ہوا تھا۔ایک طرف فرضیت کے بھی قائل ہیں اور عمل بھی نہیں کرتے اوراعتراض کرتے ہیں۔ یہ کتاب حاکم بن کرآئی ہے اگرنہیں مانتے تو قیامت کا انتظارکرو۔

(آیت۱۲۵) خاتمہ کی آیتیں ہیں مومنین کو ہدایات دی جارہی ہیں۔

[**بالحكمة**]حکمت کے ذریعہ،اگراس سے کام نہیں بنتا تو انبیاء کے قصے سناؤ۔

[ان]اگرایمان نہیں لاتے تو تم فکر نہ کرو، دونوں کے ساتھ معاملہ یکساں نہیں کرے گا۔

(آیت۱۲۶) جماعتی حیثیت میں ہدایت نہیں دی جائے۔

(آیت۱۲۷)اللہ کے سہارے صبر کرو۔**استعینوا بالله لا تحزن**،ایمان نہ لانے پرغمگین نہ ہوں۔سازشوں سے نہ پریشان ہوں۔ایک جگہ مثبت اورمنفی پہلو ہے،احسن العمل والے اورڈرتے ہیں۔

سیرت طیبہ میں سماجی انصاف

...... دانشوران کشمیر سے تعامل ......

ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی،
پروفیسر وصدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

درجہ حرارت منفی۴ کا نام سنتے ہی بدن پر کپکپی طاری ہونے لگتی ہے اور اعصاب پر ارتعاش۔ پرفیسر اشتیاق دانش سے فون پر رابطہ ہوا کہ دماغ میں پلنے والے لیت ولعل کے رجحان کو کوئی شرعی حیلہ میسر آ جائے اور ۱۶۔۱۷ دسمبر ۲۰۱۷ء میں کشمیر یونیورسٹی میں ہونے والے قومی سمینار میں شرکت سے معذرت کرلوں مگر انہوں نے مجاہدانہ جوش وخروش کا اظہار کر کے ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ کہنے لگے: ہوائی جہاز کا سفر ہے، طیران گاہ پر گاڑی منتظر ہوگی۔ یونیورسٹی کے مہمان خانہ میں سردی سے بچنے کے معقول انتظامات ہوں گے۔ آڈیٹوریم میں ایئر کنڈیشننگ کا نظم ہوگا۔ نشستوں کے سامنے گیس نجاری کے ذریعہ سردی سے حفاظت ہوتی رہے گی اور سمینار کا موضوع بھی تو ماہ ربیع الاول کی مناسبت سے ہے۔ رسول اکرم ﷺ کے ذریعہ برپا کردہ سماجی انصاف۔ ہماری پیشہ ورانہ زندگی بھی تو سیرت طیبہ ہی کی برکتوں کا ظہور ہے۔ آخر ہم منع کریں تو کیسے۔ انہوں نے غیرت دلائی۔ جذبات خفتہ کو بیدار کر دیا۔

۱۵ر دسمبر کی شام پانچ بجے ہم نے طیران گاہ پر قدم رکھا تو غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی شفق نے ہمارا استقبال کیا اور یخ بستہ ہواؤں نے بھی۔ حفظ ماتقدم کے طور پر ہم دونوں نے اپنے سروں پر کلاہ سجالی تھی۔ پروفیسر دانش نے ویسے بھی اپنی ''فارغ البالی'' کو حجاب میں رکھنے کے لیے شریفانہ آداب کی پابندی کو حرز جاں بنالیا ہے۔ کلاہ کا استعمال سردیوں میں عمر کی پانچ دہائی پار کرنے والے کثرت سے کرتے ہیں لیکن قسمت خراب ہو تو دستار و کلاہ کو ہوا میں لہراتے دیر نہیں لگتی۔ اور یہ دستار و کلاہ بھی انسان کا

بھرم تھوڑی ہی دیر تک رکھ پاتی ہیں۔ تاثیر تو شخصیت کے جمال و کمال کی مرہون ہوتی ہے۔ حماسی شاعر کا مشہور شعر ہے:

لیس الجمال بمنزل　　فاعلم وان ردیت بردا

ان الجمال معادن ومنا　　قب اورثن مجدا

(خوبصورتی پوشاک سے نہیں آتی۔ یاد رکھو، خواہ تم یمنی چادر اوڑھ لو! خوبصورتی تو نام ہے اوصاف وخصائل کا جس سے مجد وکرامت کی وراثت ہاتھ آتی ہے۔)

کشمیر یونیورسٹی کا نیا مہمان خانہ آسائش اور نظافت کے ساتھ جمال وجلال کی جلوہ آرائیوں سے بھی محروم ہے مگر یونیورسٹی کے قلب میں واقع ہے اور شاہ ہمدان انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی عمارت بھی متصل ہے اس لیے ہمارے لیے وہ بہترین انتخاب ٹھہرا۔ عشاء کے فوراً بعد پروفیسر عبدالرشید بٹ صدر شعبہ اپنے دونوں رفقاء پروفیسر نسیم احمد شاہ اور پروفیسر منظور احمد بٹ کے ہمراہ آوارد ہوئے۔ مہمانوں کو تسلی دینا مقصود تھا کہ ہم آپ کی آمد سے مسرور ہیں اور مہمان نوازی کے آداب سے پوری طرح واقف ہیں۔

منتظمین سمینار سے معلوم ہوا کہ پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی اور پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی کو بھی دعوت دی گئی تھی مگر ان اکابر نے غالباً موسم کی برودت کے پیش نظر معذرت کر لی تھی۔ صدر شعبہ کی خدمت میں راقم نے اپنی دو حالیہ تصانیف پیش کیں:

۱۔ ''اللہ کے مددگار''، ان دینی واصلاحی تحریروں کا انتخاب ہے جو راقم نے بیسویں صدی کی آٹھویں اور نویں دہائیوں میں مختلف جرائد ومجلّات میں شائع کیے۔ حیات نو جامعۃ الفلاح اعظم گڑھ میں طبع شدہ بعض اداریے بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ ۲۴۰ صفحات پر مشتمل اس کتاب کے اسلوب و طرز ادا پر مثالیت کا غلبہ ہے۔

۲۔ ''سیاسیات اسلام۔ بنیادی عربی مآخذ کا مطالعہ''۔ یہ ڈاکٹر نصر محمد عارف کی عربی کتاب ''فی مصادر التراث السیاسی الاسلامی. دراسة فی اشکالیة التعمیم قبل الاستقراء والتأمیل'' کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب میں اسلام کی سیاسی فکر کے موضوع پر ۲۸۰ عربی تصانیف کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے اور ان کے مصنفین کی نشان دہی کی گئی ہے۔ سیاسیات اسلام کے موضوع پر کام کرنے والے اسکالرز کے لیے یہ رہنما کتاب ثابت ہوسکتی ہے۔

پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی نے بھی اپنی دو تصانیف میرے حوالہ کی تھیں کہ انہیں پروفیسر عبدالرشید بٹ کی خدمت میں پیش کردوں:

۱۔نقوش سیرت نبوی (تعلیم، معاشرت، معیشت اور حقوق انسانی کے حوالے سے) اسلامک بک فاؤنڈیشن نئی دہلی ۲۰۱۷ء، صفحات ۱۹۲۔

۲۔اسلامی علوم کا ارتقاء، عہد سلطنت کے ہندوستان میں، اسلامک بک فاؤنڈیشن نئی دہلی، ۲۰۱۲ء، صفحات ۱۴۴۔

عشائیہ سے فراغت کے بعد دن کی قضا نمازیں ادا کیں۔ کچھ سکون میسر ہوا تو تلاوت قرآن کا خیال آیا۔تنہائی میں تجوید کے ساتھ تلاوت کا کیف ہی کچھ اور ہے، حسن اتفاق کہ سورہ النمل کی ابتدائی آیات سے سابقہ ہوا:

طس تِلْکَ آيَاتُ الْقُرْآنِ وَكِتَابٍ مُّبِينٍ هُدًى وَبُشْرَى لِلْمُؤْمِنِينَ۔ (النمل:۱-۲)

(ط-س- یہ آیات ہیں قرآن اور کتاب مبین کی۔ ہدایت اور بشارت ہے اہل ایمان کے لیے)

ان آیات میں قرآن کریم کی تین صفات بیان ہوئی ہیں:

۱- یہ کتاب مبین ہے۔اپنے مفہوم و مدعا میں بالکل واضح ہے۔اس کے اظہار میں کوئی ابہام ہے نہ غموض۔ادب کی تمام حلاوتوں سے پر ہے۔ بلاغت اور زبان آوری کے تمام تقاضوں کی تکمیل کرتی ہے۔

۲- یہ کتاب ہدایت ہے۔ ہر طالب حق کی رہنمائی کرتی ہے۔ جویائے صداقت کو منزل تک پہنچاتی ہے۔نیت درست ہے تو ہر قاری گوہر مقصود کو پاسکتا ہے لیکن ضروری ہے کہ طلب سچی ہو اور جذبہ صادق ہو۔

۳- یہ سراپا بشارت ہے۔خوش خبری اور نوید سنانے والی کتاب ہے۔ دنیا کی سعادت اور آخرت کی نجات کا مژدہ دیتی ہے۔

تملق سے نفرت:

قرآن پاک کو پڑھیے تو اس کی آیات سے زندگی کے چشمے پھوٹتے نظر آتے ہیں۔حرکت و عمل، اقدام و انقلاب کے زمزمے ہر آیت میں گونجتے محسوس ہوتے ہیں مگر اس کے قاری رکود و جمود کا شکار ہیں۔ تبرک و تقدس کی سوغاتوں میں مست ہیں۔ سبحان اللہ اور الحمد للہ کے کلمات ادا کر کے غفلت و مدہوشی کی چادر تان لیتے ہیں۔اس کا بھرپور تجربہ حالیہ سیرت سمینار میں ہوا۔کشمیر ہی پر کیا موقوف،

ہرصوبے اور شہر میں مسلمانوں کی حالت یہی ہے۔عمل کی جگہ عملیات کا چلن ہے۔منصوبہ بندی کی جگہ طلسمات واوہام کا زور ہے۔ پروفیسر حمید نسیم رفیع آبادی تو وقفہ وقفہ سے دہراتے رہے کہ کشمیری مسلمان روایات وخرافات کے اسیر زیادہ ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ بارہمولہ کے ایک سفر میں ڈاکٹر غلام قادر لون نے ازراہِ مزاح فرمایا تھا کہ کشمیر میں کانگڑی اور پھرین کی روایت کی ایجاد یہاں کے انسانوں کو ناکارہ اور معطل بنانے کی سازش ہے۔

۱۶ر دسمبر کو گیارہ بجے سیمینار بڑے طمطراق سے شروع ہوا۔ میڈیا سینٹر کا آڈیٹوریم آج کی علمی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔صدارت شیخ الجامعہ پروفیسر خورشید اقبال اندرابی کے ذمہ تفویض تھی۔وہ بائیوٹکنالوجی مضمون کے استاذ ہیں اور اسلامی ذہن رکھتے ہیں۔قرآن کی آیات کے حوالے دیے تو اندازہ ہوا کہ تجوید کے فن سے بھی واقف ہیں، ان کی امانت و دیانت کا تجربہ مجھے پہلے بھی ہو چکا تھا۔ ۷ر مارچ ۲۰۱۷ء کی سلیکشن کمیٹی میں پروفیسر غلام یحییٰ انجم جامعہ ہمدرد نئی دہلی اور راقم نے شیخ الجامعہ کی راست بازی اور علمی امانت داری کا راست مشاہدہ کیا۔انہوں نے کمیٹی کے اراکین کی متفقہ رائے کے سامنے سرتسلیم خم کیا حالانکہ ان کی ذاتی رائے مختلف تھی جس کا اظہار انہوں نے ازروئے احتیاط کاغذات پر دستخط مکمل ہو جانے کے بعد کیا اور جب ہم لوگوں نے حیرت کا اظہار کیا تو انہوں نے برجستہ فرمایا کہ مجھے اللہ کے سامنے جواب دہی کرنا ہے۔

آج کی تقریب کے کلیدی خطیب پروفیسر اشتیاق دانش تھے۔ذمہ داران میں سے کسی نے بتایا کہ پروفیسر مصدق امین صحاف، ڈین اکیڈمک افیئر ز کشمیر یونیورسٹی کا رویہ مقررین کے تئیں سرد مہری اور مایوسی کا تھا کہ وہ درود وسلام اور عظمت ماضی کی ثنا خوانی سے آگے نہیں بڑھ رہے تھے مگر جب پروفیسر دانش نے دھیمے لب ولہجہ میں اور عقلی استدلال کے ساتھ یوروپ کی صنعت کاری اور اس کے سماجی ومعاشرتی منفی اثرات سے گفتگو کا آغاز کیا تو پروفیسر صحاف سنجیدہ ہو گئے اور ان کا خطبہ پوری تن دہی اور یکسوئی کے ساتھ سماعت کیا۔

ہمارے خطیب اور واعظ سیرت طیبہ پر گفتگو کرتے ہوئے عام طور سے متانت اور اعتدال کا خیال نہیں رکھ پاتے۔تعریف وتوصیف میں مبالغہ آرائی کی حدیں اکثر الوہیت سے جا ملتی ہیں۔ یا محاسن وشمائل کا ذکر طویل ہوتا ہے مگر مکارم واخلاق نظر انداز ہو جاتے ہیں اور دور جدید کے مسائل اور بحرانوں کا ذکر ہی نہیں آتا۔رسول مقبول ﷺ کی وصیت موجود ہے۔حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضرت

عمرؓ نے منبر سے خطاب کیا اور نبی ﷺ کی یہ حدیث سنائی:

لا تطرونی کما أطرت النصاری ابن مریم فانّما أنا عبدہ فقولوا عبداللہ ورسولہ۔(۱)

(میری تعریف میں مبالغہ آرائی نہ کرو، جس طرح عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ بن مریمؑ کی تعریف میں مبالغہ آرائی کی تھی۔ میں تو بس خدا کا بندہ ہوں۔تم لوگ صرف یہ کہو کہ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔)

اللہ کے رسول ﷺ نے مدینہ طیبہ میں جو معاشرہ قائم کیا تھا وہ خودستائی، تملق اور منافقت سے پاک تھا۔عام انسانوں کی تعریف وتوصیف میں اعتدال وتوازن کو ملحوظ رکھا جاتا تھا۔حضرت ابوموسیٰؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص کسی کی تعریف میں مبالغہ آرائی سے کام لے رہا تھا تو اللہ کے رسول ﷺ نے اسے ٹوکا۔آپؐ نے فرمایا:

أهلكتم او قطعتم ظهر الرجل۔(۲)

(تم لوگوں نے اسے تباہ کردیا، یا تم لوگوں نے اس کی پیٹھ توڑ دی۔)

تعریف میں مبالغہ آرائی سے تملق جنم لیتا ہے جو تکبر کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔اور تکبر انسان کو ڈبو دیتا ہے۔اس کی ترقی وکامرانی کے دروازے بند کر دیتا ہے اور نجات وسعادت سے محروم کر دیتا ہے۔ ماہرالقادری کہتے ہیں:

ذرے ہوئے بلند، ہوا ان کو لے اُڑی
قطرے ہوئے جو پست، گہر ہو کے رہ گئے

ڈپلومیسی یا حکمت

افتتاحی تقریب ختم ہوئی تو روایتی قہوہ سے سامعین کی تواضع ہوئی۔ظہرانہ وصلوۃ الظہر سے فراغت ہوئی تو تین متوازی علمی نشستیں بیک وقت شروع ہوگئیں۔میں نے میڈیا سینٹر آڈیٹوریم کے مقالوں سے استفادہ کو ترجیح دی۔صدارت پروفیسر ظفر احمد ریشی ڈین ریسرچ کشمیر یونیورسٹی نے کی۔ایک دلچسپ بحث رسول اکرم ﷺ کے نظام سفارت سے متعلق اٹھی۔فاضل مقالہ نگار ڈاکٹر الطاف حسین یاتو اسسٹنٹ پروفیسر اسلامک اسٹڈیز گورنمنٹ ماڈل ویمنز ڈگری کالج کپواڑہ کا موضوع تھا:''ریاست مدینہ۔دور رسالت کی سفارت کاری کا مطالعہ''۔

مقالہ انگریزی میں تھا اور سفارت کاری کے لیے ڈپلومیسی لفظ کا استعمال کیا گیا تھا۔ جناب صدر نے دعوت خطاب دی تو دخل در معقولات کرتے ہوئے مشورہ دے ڈالا کہ رسول اکرم ﷺ کی مبارک جدوجہد کے لیے ڈپلومیسی لفظ کا استعمال نامناسب ہے کیونکہ ڈپلومیسی کے عناصر میں فریب، کذب بیانی اور مکاری بدرجہ اتم شامل ہیں۔ ضروری ہے کہ ہم خود اپنی اصطلاحات استعمال کریں۔

ستم یہ ہوا کہ سامعین کی اگلی صف میں تشریف فرما ایک صاحب علم شخصیت پروفیسر سید محمد طیب کاملی پرنسپل اورینٹل کالج جامعہ مدینۃ العلوم حضرت بل نے فوراً مشورہ دے ڈالا کہ ڈپلومیسی کی جگہ حکمت لفظ کا استعمال ہونا چاہیے۔ پچھلی صفوں میں بیٹھے بعض حضرات نے فوراً اس مشورہ کی تصدیق بھی کر دی۔

حکمت کی اصطلاح بلا شبہ قرآن کریم کی اصطلاح ہے اور رسول اکرم ﷺ کے سفارتی نظام میں اس کی بھرپور کارفرمائی بھی نظر آتی ہے مگر یہ وسیع تر اصطلاح ہے اور اس کے اسرار و مضمرات زیادہ جامع و مانع ہیں۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ اپنے استاد مولانا حمید الدین فراہیؒ (۱۸۶۳ء۔۱۹۳۰ء) کی تصنیف مفردات القرآن کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ:

''رہی حکمت تو وہ تعبیر ہے اس قوت وصلاحیت کی جس سے انسان معاملات کا فیصلہ حق کے مطابق کرتا ہے۔ حضرت داوٗد علیہ السلام کی تعریف میں ارشاد ہوا ہے: و آتیناہ الحکمۃ و فصل الخطاب۔ (۳) (ہم نے اس کو حکمت عطا کی اور فیصلۂ معاملات کی صلاحیت)۔ یہاں فصل الخطاب کے لفظ سے اس اثر کو بیان کیا ہے جو حکمت کا ثمرہ ہے۔ جس طرح فیصلہ معاملات کی صلاحیت حکمت ثمرات میں سے ہے اسی طرح اخلاق کی پاکیزگی اور تہذیب بھی اس کے ثمرات میں سے ہے۔ اسی وجہ سے اہل عرب حکمت کا لفظ انسان کی اس قوت وصلاحیت کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں جو عقل ورائے کی پختگی اور شرافت واخلاق کی جامع ہوتی ہے۔ چنانچہ دانش منداور مہذب آدمی کو حکیم کہا جاتا ہے اور جو بات عقل اور دل دونوں کے نزدیک بالکل واضح ہو، اس کو حکمت سے تعبیر کرتے ہیں۔'' (۴)

سورہ القصص آیت ۱۴ (۵) کی تفسیر میں مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ نے لکھا ہے کہ حکم سے مراد حکمت، دانائی، فہم وفراست اور قوت فیصلہ ہے اور علم سے دینی و دنیوی علوم دونوں مراد ہیں کیونکہ اپنے والدین کے ساتھ ربط وضبط قائم رہنے کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے باپ دادا کی تعلیمات سے بھی واقفیت حاصل ہوگئی، اور بادشاہِ وقت کے ہاں شاہزادے کی حیثیت سے پرورش پانے کے باعث ان کو وہ تمام دنیوی علوم بھی حاصل ہوئے جو اس زمانے کے مصر میں متداول تھے۔ (۶)

انگریزی میں ڈپلومیسی کی اصطلاح اس سیاسی گفت وشنید کے لیے استعمال ہوتی ہے جو دوملکوں کے درمیان مسائل کے پرامن تصفیہ کے لیے ہوتی ہے۔(۷)بدقسمتی سے یورپ کی مکاریوں اورعہد جدید کی پیہم منافقتوں کی وجہ سے یہ اصطلاح بدنام اور معتوب بن گئی۔اسلام کے نظام سفارت پرعربی میں دور جدید کے معروف محقق صلاح الدین المنجد کی کتاب کافی معروف ہے جس کا عنوان ہے:النظم الدبلوماسية في الاسلام۔(۸)

انگریزی میں بھی اس موضوع پر کئی کتابیں منظر عام پرآچکی ہیں(۹)راقم کی ایک کتاب ۱۹۹۵ء میں اسلامک پبلی کیشنز لمٹیڈ لاہور سے شائع ہوچکی ہے جس کا عنوان ہے: Principles of diplomacy in Islam۔

مجھے یہ دیکھ کرخوشی ہوئی کہ مقالہ نگارڈاکٹر الطاف حسین یاتو نے ان غیرضروری مداخلتوں کوتسلیم نہ کیااوراپنی بات سلیقے سے پیش کی۔

ممتاز اسلامی امت

چار بجے سے پونے چھ بجے تک دوسری متوازی نشستوں کا وقت مقرر تھااورابن خلدون آڈیٹوریم کے اجلاس کی صدارت کرنے کا فرمان شاہی میرے نام پہلے سے جاری ہوچکا تھا۔ میں نے پروفیسر عبدالرشید بٹ کے حکم کی تعمیل کی اوران کی قیادت میں جائے اجلاس پر وقت سے پہلے پہنچ گیا۔ابھی پروفیسر صلاح الدین تاک صدر شعبہ عربی کشمیر یونیورسٹی کی صدارت میں اجلاس اوّل کے آخری مقالہ کی خواندگی جاری تھی۔جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے کیرالوی ریسرچ اسکالرابراہیم کےامت اسلامیہ کے تہذیبی کردار پراپنا مقالہ پڑھ رہے تھے۔ میں نے جناب صدر کی اجازت سے ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری تصور کیا۔

میثاق مدینہ کا مطالعہ کرتے وقت عام طور پرمؤرخین نے امت کی تعریف وتعیین میں غیر سنجیدگی کا مظاہرہ کیا ہے اور یہود کومسلمانوں کے ساتھ شامل کرکے آج کے نظریہ مغربی قومیت کے لیے جواز پیش کیا ہے۔یہ اشتباہ تقسیم ہند کے موقع پرمولانا ابوالکلام آزادؒ جیسے عالم دین اورسیاسی رہنما کوبھی ہوا۔ انہوں نے میثاق مدینہ کے ایک جملہ پراکتفا کرلیا اور بقیہ دفعات کے مطالعہ کوغیرضروری تصور کیا۔وہ جملہ یہ ہے:

وان يهود بني عوف أمة مع المومنين۔(۱۰)

(بنوعوف کے یہود مسلمانوں کے ساتھ ایک امت ہیں۔)

اس جملہ میں بھی أمةٌ مع المومنین کے الفاظ قابل غور ہیں۔علمائے اسلام نے ان الفاظ کو أمةٌ من المومنین کے مرادف سمجھ کر مع اور من کے فرق کو ختم کر دیا، حالانکہ دونوں حروف کے مفہوم میں فرق ہے۔اس کا صحیح ترجمہ ہوگا: یہود بنی عوف مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ایک امت ہیں یعنی متوازی اور جدا۔

میثاق مدینہ کی دوسری دفعات میں اس کی صراحت موجود ہے۔ میثاق کی پہلی دفعہ کے الفاظ ہیں:

''وہ (یعنی مسلمان مہاجرین وانصار کے دوطبقات اوران کے مسلم لواحقین وتبعین) ایک امت ہیں جو دوسرے لوگوں سے علیحدہ اور ممتاز ہیں۔أمة واحدة من دون الناس.

میثاق مدینہ کی دفعہ ۱۵ کی عبارت ملاحظہ کیجئے:

''خدا کا تحفظ (ذمہ) ایک ہے: ان (مسلمانوں میں سے) کسی ادنی کی ضمانت ان سب پر واجب العمل ہے۔تمام مسلمان ایک دوسرے کے بھائی اور دوست ہیں دوسرے تمام لوگوں سے ماسوا۔ انّھم موالی من دون الناس۔(۱۱)

ان تمام دفعات میں مسلم امت کو دوسری تمام اقوام وملل سے منفرد وممتاز قرار دیا گیا ہے۔دوسری اقوام وطبقات کی حیثیت اس میثاق میں حلیف کی تھی۔ اس لیے بعض علماء نے اس میثاق کو فوجی اتحاد (Military alliance) قرار دیا ہے جس کا مقصد فوجی معاملات میں اشتراک تھا (۱۲) پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی نے اپنی گراں قدر تصنیف میں میثاق مدینہ کی تمام دفعات کا مفصل مطالعہ کیا ہے اور امت مسلمہ کی امتیازی حیثیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔(۱۳) حکیم الامت علامہ محمد اقبالؒ نے اسی لیے صراحت کی ہے:

اپنی ملت کو قیاس اقوام مغرب پر نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک ونسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

تکریم حجاب کے تقاضے

راقم کی صدارت میں آٹھ مقالات پڑھے گئے۔جناب نذرالاسلام گورنمنٹ کالج اننت ناگ میں اور مدثر مجید گورنمنٹ ڈگری کالج بیج بہارہ میں استاد تھے بقیہ چھ مقالہ نگار ریسرچ اسکالر تھے۔

نظامت کا فریضہ محترمہ قرۃ العین انجام دے رہی تھیں۔ وہ ڈائس سے مقالہ نگار کو دعوت خطاب دیتیں اور پھر پیچھے جا کر اپنی نشست سنبھال لیتیں۔ مجھے تعجب ہوا کہ ایک باحجاب خاتون ناظمہ بار بار پچھلی نشست پر جانے کا تکلف کیوں کر رہی ہیں۔ ایک رضا کار نے مجھے بتایا کہ یہاں کی روایت یہی ہے۔ میں نے ناظمۂ اجلاس سے درخواست کی کہ وہ ڈائس پر اگلی نشست پر تشریف رکھیں۔ انہوں نے فراست کا ثبوت دیا۔ بعد میں صدر شعبہ نے ان کی لیاقت وفطانت کی تحسین کی۔ حجاب کی تکریم کا تقاضا ہے کہ باصلاحیت خواتین علمی وسماجی میدانوں میں وقار اور متانت کے ساتھ آگے بڑھیں اور مغرب زدہ خواتین کو قیادت کے مقام سے ہٹا کر خود قائدانہ کردار ادا کریں۔ اب مسلم خواتین میں تیزی سے بیداری آ رہی ہے اور وہ تہذیب حجاب کی پاسداری کے ساتھ زندگی کے مختلف میدانوں میں آگے بڑھ رہی ہیں۔ (۱۴)

بعض ریسرچ اسکالرز نے زمانہ شناسی سے آگے بڑھ کر خود فریبی کا مظاہرہ کیا۔ نوید انجم اور محمد دانش پنجابی نے اپنے مقالات پڑھے اور چپکے سے کھسک گئے۔ اس طرح اپنے مقالات کو بہتر بنانے والی تجاویز سے محروم رہے۔ کچھ اسکالرز کے موضوعات سمینار کے مرکزی موضوع سے بے میل اور بے ربط تھے جبکہ بعض مقالات اپنے مواد اور پیش کش ہر دو اعتبار سے بہتر اور قابل تعریف تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سمینار کا مرکزی موضوع سماجی انصاف تھا مگر مقالات سیرت طیبہ کے تمام موضوعات کا احاطہ کرتے نظر آتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی کانفرنس ہے، علمی مذاکرہ نہیں۔ دو ہفتوں کی محنت شاقہ کے بعد منتظمین نے بہر حال کرشمہ دکھا دیا اور ایک سو دس مقالات حاصل کر لیے، یہ اپنے آپ میں ایک ریکارڈ تھا۔

مقالات کی خواندگی جاری تھی کہ نماز مغرب کی اذان شروع ہو گئی۔ میں نے پورے عمل کو یک لخت روک دیا۔ اذان مکمل ہوئی تو تجویز آئی کہ ایک مقالہ بچ گیا ہے اس کی خواندگی مکمل ہو جائے تو نماز اطمینان سے ادا کر لیں گے۔ میں نے اصرار کیا کہ نماز مغرب کا وقت مختصر ہوتا ہے پہلے نماز پڑھ لی جائے۔ پھر سمینار کی کارروائی مکمل کی جائے۔ چنانچہ وہیں ڈائس پر باجماعت نماز کا اہتمام ہوا۔ اس سے پہلے ۲۵ رنومبر ۲۰۱۷ء کو جامعہ محمدیہ منصورہ مالیگاؤں مہاراشٹر کے ایک دو روزہ سمینار میں یہی صورت حال پیش آئی تھی۔ مقررین کو آٹھ منٹ کا وقت دیا گیا۔ مجھے سب سے آخر میں گفتگو کرنا تھی۔ اور نزلہ تو عضو ضعیف پر ہی گرتا ہے۔ پیش رو مقالہ نگاران نے تمام ہدایتوں کو نظر انداز کر دیا۔ آخر کار ناظم اجلاس نے حکم دیا کہ جو وقت میرا مقدر تھا اس میں مزید قطع ہونے کا خدشہ ہے اس لیے مغرب کی اذان شروع ہو جائے تو میں تسلسل کو قائم رکھوں کیونکہ اذان کے بعد یہاں دو رکعت سنتوں کے لیے بھی وقت مخصوص

ہوتا ہے، میں نے ناظم اجلاس کی تجویز مسترد کر دی اور باادب درخواست کی کہ اذان کی آواز کانوں میں پڑتے ہی میں اپنی گفتگو روک دوں گا۔ اذان کے بعد علمی مذاکرہ کا تسلسل نامناسب ہے۔ اور مجھے کوئی شکوہ بھی نہیں۔

ڈاکٹر شیخ جمیل علی اسلامک یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی میں ہردل عزیز استاد ہیں۔ اسلامیات کی تدریس و تحقیق کو پیشہ ہی نہیں عبادت تصور کرتے ہیں۔ لپک کر ملے اور عقیدت سے معانقہ کیا۔ بارہمولہ پچھلے کئی سالوں سے میرے لیے مرکز محبت رہا ہے۔ انہوں نے بارہمولہ کے کسی پروگرام میں میری شرکت کی تفصیل چاہی۔ سخت برودت کی وجہ سے میں نے انکار کیا۔ مہمان خانہ پہنچے تو پیرومرشد سہیل بشیر کار کی خیریت طلبی آ گئی اور یہ نوید بھی کہ ان کے ہاں بیٹے کا تولد ہوا ہے۔ میں نے سہیل کی مناسبت سے بیٹے کا نام سہل تجویز کیا۔ انہوں نے تاکید کی کہ چلہ کلاں کی آمد آمد ہے۔ باہر آمدورفت سے پرہیز کروں ورنہ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

عدل نبوی کی خصوصیات

سیرت مطہرہ میں سماجی انصاف کی نظریاتی بنیادوں کے موضوع پر خطاب کی دعوت مجھے دی گئی تھی ۷ار دسمبر کو الوداعی اجلاس میں۔ مجھے اس ترتیب کی معنویت پر کوئی اشکال قائم کرنے سے دلچسپی نہ تھی مگر ڈاکٹر عبدالرشید بٹ صدر شعبہ اسلامیات نے اس کی خود ہی وضاحت کر دی اور میری الجھن رفع ہوگئی۔ وہ چاہتے تھے کہ مندوبین سمینار فکری و نظریاتی زادراہ ساتھ لے کر جائیں اس لیے مجھ کو آخری اجلاس میں عرض معروض کرنے کا حکم دیا گیا۔

میں نے اپنی گفتگو میں رسول اکرم ﷺ کے قائم کردہ عدل کی دو خصوصیات پیش نظر رکھیں:

ا۔ مدینہ میں نافذ کردہ سماجی انصاف کا نظام کوئی محدود اور مخصوص نظام نہ تھا۔ یہ ایک مکمل اور جامع و ہمہ گیر نظام عدل تھا۔ زندگی کے تمام مظاہر اور دائرے اس کی قلم رو میں شامل تھے۔ مادی و معنوی تمام قدروں کا امتزاج اس نظام کے اندر موجود تھا۔

۲۔ یہ معاشرہ باہمی تعاون، تکافل اور مرحمت و مواسات پر استوار تھا۔

ان دو بنیادی خصوصیات کے ساتھ اللہ کے رسول ﷺ نے سماجی انصاف کی نظریاتی بنیادیں بھی استوار کیں۔ میری مفصل گفتگو ان فکری بنیادوں کی تفہیم پر ہوئی:

ا۔ ضمیر کی مطلق آزادی

۲۔مکمل انسانی مساوات

۳۔نظام کفالت کا قیام

اللہ کے رسولﷺ نے مکہ مکرمہ میں مظلومی ومحرومی کے باوجود انسانیت کی آزادی کی تحریک چلائی۔ یہ تحریک رسول رحمت کے منصبی فرائض کا حصہ تھی۔قرآن نے صراحت کی، نبی کی بعثت کا مقصد بے جابندشوں کو کھولنا اور تمام خودساختہ پابندیوں کو ہٹانا ہے۔فرمایا:

الَّذِيْنَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الأُمِّيَّ الَّذِىْ يَجِدُونَهُ مَكْتُوباً عِندَهُمْ فِىْ التَّوْرَاةِ وَالإِنجِيْلِ يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَآئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالأَغْلاَلَ الَّتِىْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِيْنَ آمَنُواْ بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُواْ النُّورَ الَّذِىَ أُنزِلَ مَعَهُ أُوْلَـئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُون. (الاعراف:۱۵۷)

(جو اس پیغمبر نبی امی کی پیروی اختیار کریں جس کا ذکر انہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے۔ وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، ان کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے، اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔لہٰذا جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی حمایت ونصرت کریں اور اس روشنی کی پیروی اختیار کریں جو اس کے ساتھ نازل کی گئی ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں۔)

مولانا مودودیؒ نے آیت میں مذکور اصرھم والاغلال التی کانت علیھم کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہود کے فقیہوں نے اپنی قانونی موشگافیوں سے، ان کے روحانی مقتداؤں نے اپنے تورع کے مبالغوں سے، اور ان کے جاہل عوام نے اپنے توہمات اور خودساختہ حدود وضوابط سے ان کی زندگی کو جن بوجھوں تلے دبا رکھا تھا اور جن جکڑبندیوں میں کس رکھا تھا، اس پیغمبر نے وہ سارے بوجھ اتار دیے اور وہ تمام بندشیں توڑ کر زندگی کو آزادی دلا دی۔(۱۵)

مدینہ کے معاشرے میں حضرت زید بن حارثہؓ اور ان کے بیٹے حضرت اسامہ بن زیدؓ کو ان کے اوصاف وحسنات کی وجہ سے جو مقام رفیع ملا اس سے قریش کے سادات بھی محروم رہے۔حضرت زیدؓ رسول اللہ کے آزاد کردہ غلام تھے مگر ۸ھ میں غزوۂ موتہ واقع ہوا تو اسلامی لشکر کا امیر انہیں مقرر کیا گیا جبکہ حضرت جعفر بن ابی طالبؓ اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ جیسے سادات اس لشکر میں موجود تھے۔باپ کے انتقال کے بعد بیٹے کو بھی وہی سرفرازی عطا ہوئی۔ ۱۱ھ میں ایک لشکر ترتیب دیا گیا تو اس کا امیر

حضرت اسامہؓ کومقرر کیا گیا۔ ان کی نوعمری کی وجہ سے صحابہ کے درمیان چہ می گوئی شروع ہوگئی تو اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

قد بلغنی انکم قلتم فی اسامة و انه احب الناس الیَّ۔(١٦)

(مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم لوگ اسامہ کے بارے میں باتیں بنا رہے ہو۔ دیکھو وہ مجھے سب سے زیادہ محبوب ہیں۔)

ایثار کی جلوہ نمائی

اللہ کے رسول ﷺ نے معاشی ومعاشرتی کفالت کا جو نظام قائم کیا اس کی بنیاد قانون کے ماسوا مرحمت ومواسات کی تبلیغ وتاکید پر تھی۔ اللہ کے رسول نے انصار ومہاجرین کے درمیان مواخات کا جو نظام قائم کیا وہ انسانی تاریخ کا ناقابل یقین معجزہ ہے۔ صحابہ کرام نے ایثار واحسان کی جو مثالیں قائم کیں وہ قیامت تک کے لیے نمونہ بن گئیں۔ قرآن نے جگہ جگہ اس ایثار کی مدح سرائی کی:

يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِيْ صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَى أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (الحشر:٩)

(یہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کرکے ان کے پاس آئے ہیں اور جو بھی کچھ ان کو دیا جائے اس کی کوئی حاجت تک یہ اپنے دلوں میں محسوس نہیں کرتے اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچا لیے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں۔)

اس آیت کے شان نزول سے متعلق بخاری شریف میں ایک دلچسپ واقعہ نقل کیا گیا ہے جس سے صحابہ کرامؓ کے ایثار واحسان پر روشنی پڑتی ہے۔ اس واقعہ کے راوی حضرت ابو ہریرہؓ ہیں وہ فرماتے ہیں:

أنّ رجلا أتى النبی ﷺ فبعث الی نسائه فقلن مامعنا الاالماء. فقال رسول الله ﷺ من یضم او یضیف هذا. فقال رجل من الانصار أنا. فانطلق به الی امرأته فقال: أکرمی ضیف رسول الله ﷺ. فقالت:ماعندنا الا قوت صبیانی. فقال:فهیء طعامک واصبحی سراجک ونومی صبیانک.اذا ارادوا عشاء فهیأت طعامها واصبحت سرجها ولومت صبیانها، ثم قامت کأنها تصلح سراجها فاطفأته، فجعلا

يـريـانـه انهـمـا يـأكـلان فبـاتـا طـاويـيـن. فلما أصبح غدا الى رسول الله ﷺ فقال: ضـحـک الـلـه الـلـيـلة أو عـجـب مـن فـعـالـكـما. فأنزل الله ويؤثرون على انفسهم الخ۔(۱۷)

(ایک شخص نبیﷺ کی خدمت میں آیا(وہ بھوکا تھا)آپ نے اپنی ازواج سے گھر کا ماجرا دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ ہمارے پاس پانی کے سوا کچھ نہیں ہے۔آخر آپﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ کون اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے یا کون اس کی ضیافت کرتا ہے؟ایک انصاری نے پیش کش کی: میں اس کی میزبانی کرتا ہوں۔

وہ مہمان کے ساتھ اپنی بیوی کے پاس آیا اور کہا کہ یہ رسول اللہ کے مہمان ہیں ان کی ضیافت کرو۔ بیوی نے جواب دیا: ہمارے پاس بس بچوں کا کھانا ہے۔شوہر نے مشورہ دیا: کھانا بناؤ۔ چراغ جلا کے رکھ دو اور بچوں کو جب وہ کھانا مانگیں (بہانہ کر کے) سلا دو۔ بیوی نے کھانا تیار کیا۔ چراغ جلا کے رکھا اور بچوں کو بہلا پھسلا کے سلا دیا۔ پھر وہ اٹھی گویا کہ چراغ درست کرنے کا ارادہ رکھتی ہے، مگر اسے گل کر دیا۔اور میاں بیوی دونوں نے اس طرح کا مظاہرہ کیا کہ گویا وہ کھانے میں شریک ہیں۔ دونوں نے رات فاقے سے گزاری۔صبح ہوئی تو انصاری مسلمان رسول اللہﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔آپ نے فرمایا رات کو تمہارے عمل پر اللہ کو ہنسی آ گئی یا اللہ نے تم دونوں کے عمل پر تعجب کا اظہار کیا۔ پھر یہ آیت ویؤثرون على أنفسهم نازل ہوئی۔)

اپنی ضروریات پر دوسروں کی ضروریات کو ترجیح دینے اور خود فاقہ کر کے مہمانوں کی تکریم کرنے کا یہ واقعہ اس معاشرہ کی تصویر کشی کرتا ہے جس میں معاشرتی کفالت کا نظام کارفرما تھا۔ جہاں امراء اور غریبوں کے درمیان کوئی طبقاتی کشمکش برپا نہ تھی اور جس کے افراد بنیان مرصوص بن کے تعمیر و ترقی کے سارے پروگراموں میں شرکت کرتے تھے۔

طمع اور خود غرضی کی بیخ کنی

سورہ الحشر کی آیت مذکورہ میں ایک طرف انصار و مہاجر مسلمانوں کی سیر چشمی اور فراخ دلی کی تحسین ہے کہ وہ وسیع القلبی کے ساتھ مہاجروں کے قافلوں کا استقبال کر رہے ہیں اور ان کی آمد پر اپنے دلوں میں کوئی رشک و حسد محسوس کرنے کے بجائے ان کی کھل کر امداد و اعانت کر رہے ہیں تو دوسری طرف نفس انسانی کی ایک خطرناک بیماری سے آگاہی بھی ہے۔ شح کے معنی حرص و طمع اور لالچ کے

ہیں۔نفس کی طرف اس کی نسبت سے (شح نفسہ) یہ بات نکلتی ہے کہ یہ نفس کے دواعی ومحرکات میں سے ہے اور انتہائی خطرناک داعیہ اور محرک ہے۔ اگر اس داعیہ کو آدمی قابو میں نہ رکھ سکے تو یہ چیز آدمی کی آخرت کو برباد کردیتی ہے۔(۱۸) یہ ٹکڑا منافقین کو بھی خبردار کررہا ہے کہ وہ اس بیماری میں مبتلا ہیں۔اگر انہوں نے اس کے علاج کی فکر نہ کی تو وہ ابدی خسران سے دوچار ہوں گے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

یتقارب الزمان وینقص العلم ویلقی الشح ویکثر الھرج.

(زمانہ قریب آ لگے گا۔علم کم ہوجائے گا اور تنگ دلی پیدا ہوجائے گی اور ہرج کی کثرت ہوگی۔)

صحابہ نے پوچھا: وما الھرج؟

(یہ ہرج کیا چیز ہے؟)

آپ نے فرمایا: القتل القتل۔(۱۹)

(خوں ریزی، خوں ریزی!)

اس حدیث میں زمانی مسافتوں کے خاتمہ، علم کی کمی، خودغرضی وتنگ دلی کی بہتات اور قتل وخوں ریزی کی کثرت کا ایک ساتھ تذکرہ بڑا بلیغ ہے۔جدید تہذیب کی غیر متوازن تیز رفتار ترقی نے سارے خبائث کو جمع کردیا ہے۔اور اس کے نتیجے میں قتل وخون معمولات میں شامل ہوچکے ہیں۔مدینہ طیبہ کا پاکیزہ معاشرہ اس طمع ولالچ، تنگ دلی اور خودغرضی سے بڑی حد تک پاک تھا۔قرآن پاک کے احکام اس سیاق میں بالکل واضح ہیں:

لِيُنفِقْ ذُو سَعَةٍ مِّن سَعَتِهِ وَمَن قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْساً إِلَّا مَا آتَاهَا سَيَجْعَلُ اللَّهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُسْراً (الطلاق:۷)

(خوش حال آدمی اپنی خوش حالی کے مطابق خرچ کرے اور جس کو رزق کم دیا گیا ہو وہ اسی مال میں سے خرچ کرے جو اللہ نے اسے دیا ہے۔اللہ نے جس کو جتنا کچھ دیا ہے اس سے زیادہ کا وہ اسے مکلّف نہیں کرتا۔بعید نہیں کہ اللہ تنگ دستی کے بعد فراخ دستی بھی عطا فرمادے۔)

تنگی کے ساتھ فراخی

یہ احکام عائلی زندگی کے سیاق میں دیے گئے ہیں اور براہ راست رضاعت سے متعلق ہیں مگر ان سے اصولی ہدایات بھی مستنبط ہوتی ہیں، جن کو ملحوظ رکھا جائے تو معاشرہ میں کوئی کشاکش برپا نہ ہو۔انفاق

کا معیار قرآن نے بتایا کہ کشادہ حال شخص کو اپنی دولت وثروت اور آمدنی کے مطابق راہ خدا میں خرچ کرنا چاہیے اور غریب اور تنگ دست شخص کو اپنی طاقت کے مطابق۔ ایسا نہ ہو کہ امیر شخص کنجوسی اور تنگ دلی کا مظاہرہ کرے اور غریب شخص پر اس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ ڈال دیا جائے۔ ہر شخص اپنے معیار اور اپنی استطاعت کے مطابق معاشرہ کے نظام کفالت کو تقویت دے اور تعمیر وترقی کے کاموں میں حصہ داری نبھائے۔

آیت کے آخری ٹکڑے میں تسلی ہے غریبوں کے لیے۔ اگر وہ صبر وقناعت اور ایمان وتوکل کی زندگی بسر کریں گے اور معاشرہ میں اپنی مؤثر حصہ داری نبھائیں گے تو اللہ تعالیٰ تنگی کے بعد آسانی پیدا کرے گا۔ غربت اور احتیاج کے باوجود محض اللہ کی خوشنودی کے لیے جو لوگ ایثار واحسان کا رویہ اختیار کرتے ہیں ان کے رزق میں اللہ تعالیٰ برکت دیتا ہے۔(۲۰) اس حقیقت کو قرآن نے بار بار ذہن نشین کرایا ہے:

فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْراً إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْراً (المنشرح:۶۔۷)

(پس حقیقت یہ ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔ بے شک تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔)

سورہ الطلاق کی اوپر والی آیت میں قرآن نے تنگ دستی کے بعد فراخ دستی کی بشارت دی تھی۔ ان آیات المنشرح میں جو بات کہی گئی ہے وہ بڑی متناقض معلوم ہوتی ہے۔ یعنی تنگی کے ساتھ فراخی کا ذکر، کیونکہ یہ دونوں چیزیں بیک وقت جمع نہیں ہوتیں۔ اس جمع بین الاضداد کے اسلوب میں بڑی ادبیت ہے۔ مولانا مودودیؒ کہتے ہیں کہ تنگی کے بعد فراخی کہنے کے بجائے تنگی کے ساتھ فراخی کے الفاظ اس معنی میں استعمال کیے گئے ہیں کہ فراخی کا دور اس قدر قریب ہے کہ گویا وہ اس کے ساتھ ہی چلا آ رہا ہے۔ (۲۱) اسی حقیقت کی ترجمانی شاعر نے کی ہے:

سختی کے بعد عیش کا امیدوار رہ
آخر ہے روزہ دار کو اک روز عید یاں

رات میں پروفیسر عبدالرشید بٹ اور پروفیسر منظور احمد بٹ مہمان خانہ آئے۔ کشمیر سے باہر کے مہمان ہم صرف دو افراد تھے۔ پروفیسر دانش کی خیریت معلوم کی اور پھر میرے کمرے میں براجمان ہو گئے۔ انتہائی حیرت اس وقت ہوئی جب صبح آٹھ بجے پروفیسر منظور احمد بٹ کو مہمان خانے میں موجود پایا۔ نماز فجر کے بعد انہوں نے اپنی گاڑی کو گرم پانی سے غسل دیا تھا۔ تب برف باری کی تاثیر کم ہوئی تھی

اور وہ مہمانوں کو الوداع کہنے کے قابل ہو سکے تھے۔ ان کی کرم گستری دیکھ کے ہم دونوں ان سے لپٹ گئے۔ بڑی محبت سے معانقہ کیا اور طیران گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ مجھے حضرت ابوذرؓ کی روایت کردہ حدیث بار بار یاد آتی رہی اور اپنے احباب کی عنایات کی طرف توجہ دلاتی رہی۔ حضرت ابوذرؓ نے دریافت کیا:

یا رسول الله الرجل یحب القوم ولایستطیع ان یعمل کعملهم؟

(اے اللہ کے رسول! ایک شخص کچھ لوگوں سے محبت کرتا ہے مگر ان کی طرح عمل نہیں کر پاتا؟)

آپ نے فرمایا:

انت یا اباذر مع من احببتَ.

(ابوذر، تمہارا شمار ان ہی میں ہوگا جن سے تم محبت کرو گے۔)

حضرت ابوذرؓ نے فوراً کہا:

فإني احب الله ورسوله.

(میں تو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوں۔)

آپ ﷺ نے فرمایا:

فإنک مع من احببتَ.

(تو تمہارا شمار ان ہی میں ہوگا جن سے تم محبت کرو گے۔)

راوی عبداللہ بن الصامت کہتے ہیں کہ حضرت ابوذرؓ نے پھر وہی جملہ دوہرایا اور اللہ کے رسول ﷺ نے بھی پھر وہی بات کہی۔ (۲۲)

میرا وظیفۂ حیات تو بس یہ ہے کہ:

احب الصالحین ولست منهم

لعل الله یرزقني صلاحاً

(میں نیک لوگوں سے محبت کرتا ہوں جبکہ ان کے پاسنگ کے برابر بھی نہیں ہوں، شاید اللہ تعالیٰ کچھ صالحیت مجھے بھی عطا فرما دے!)

حواشی و تعلیقات

(۱) بخاری محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، کتاب احادیث الانبیاء، حدیث: ۳۴۴۵

(۲) بخاری محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، باب ۶۰۶، ما یکرہ من التمادح، حدیث ۹۹۷، اسی باب کی اگلی حدیث ۹۹۸ میں حضرت عبداللہ بن ابوبکرہ نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ نبی ﷺ کے سامنے ایک شخص کا تذکرہ ہوا تو مجمع میں موجود کسی نے اس کی تعریف کردی۔ اس پر آپ نے فرمایا:

ویحک قطعت عنق صاحبک یقوله مرارا ان کان احدکم مادحا فلیقل احسب کذا و کذا أن کان یری انه کذالک وحسیبه الله ولایزکّی علی الله أحداً۔

(تیرا برا ہو۔ تو نے اس کی گردن کاٹ دی۔ آپ بار بار یہی دہراتے رہے۔ اگر تم میں سے کسی شخص کو دوسرے کی تعریف کرنی پڑے تو وہ ان الفاظ کا استعمال کرے کہ میں اسے فلاں اوصاف کا آدمی سمجھتا ہوں۔ جہاں تک میری معلومات ہیں۔ ویسے اللہ کو اس کا پورا علم ہے۔ وہ خدا کا حوالہ دے کر کسی کی پاک دامنی کی حکایت نہ کرے۔ بعض روایات میں ویحک کی جگہ ویلک کے الفاظ آئے ہیں، یعنی تیری ہلاکت ہو۔)

(۳) قرآن کریم، سورہ ص: ۲۰

(۴) اصلاحی امین احسن، تدبر قرآن، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، جلد اول، اگست ۱۹۷۶ء، ص ۲۹۷

(۵) قرآن کریم، القصص: ۱۴، آیت ہے:

وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَاسْتَوَى آتَيْنَاهُ حُكْماً وَعِلْماً وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ

(جب موسیٰ اپنی پوری جوانی کو پہنچ گیا اور اس کا نشو ونما مکمل ہوگیا تو ہم نے اسے حکم اور علم عطا کیا۔ ہم نیک لوگوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔)

(۶) مودودی سید ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی، جلد سوم، مارچ ۲۰۱۷ء، ص ۶۲۰۔۶۲۱

(۷) ڈپلومیسی کی اس تعریف کے لیے درج ذیل حوالے دیکھئے:

Harold Nicolson, Diplomacy, Oxford University Press, 1968,pp.4-5

''Diplomacy is the management of international relations by negotitaion, the method by which these

relations are adjusted and managed by ambassadors, envoys, by buisiness or art of the diplomatists". See also:

K.M. Panikkar, Principles and practice of Diplomacy, Ramjit Printers and Publishers Delhi, 1952, p.62, The New Encyclopedia Britannica, 1977, Vol.3, p. 565

(۸)المنجد،صلاح الدین،النظم الدبلوماسیۃ فی الاسلام، بیروت ۱۹۸۳ء

(۹) Afzal Iqbal, Prophet's Diplomacy, Clande Alam Stark,Massachausetts, 1975.

(۱۰)مولانا آزاد کے تصور قومیت پر اسلامی تنقید کے لیے دیکھئے: فلاحی عبید اللہ فہد، سیاست الہلال اور ہندوستانی مسلمان، الہلال پبلی کیشنز کلکتہ، ۱۹۹۰ء، ص ۸۵۔۱۱۰

(۱۱) Hamidullah M. The First Written Constitution in the World, Hyderabad, 1983, pp.26-34

(۱۲)مودودی سید ابوالاعلی، تحریک آزادی ہند اور مسلمان، حصہ اول، اسلامک پبلی کیشنز لمٹیڈ لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۳۲۱۔۳۲۲

(۱۳)تفصیل کے لیے دیکھئے:

Siddiqui, Muhammad Yasin Mazhar, Organisation of Government Under the Prophet, Idara-i-Adabiyat Delhi, 1987, pp. 07-15

(۱۴)تفصیل کے لیے دیکھئے، میری حالیہ تصنیف، تہذیب حجاب اور خواتین، پبلی کیشن ڈویژن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۲۰۱۷ء، صفحات ۲۵۴

(۱۵)مودودی سید ابوالاعلی، تفہیم القرآن، حوالہ بالا، جلد دوم، ص ۸۵۔۸۶

(۱۶)بخاری محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، کتاب المغازی، باب ۵۵۷، بعث النبی ﷺ اسامۃ بن زید فی مرضہ الذی توفی فیہ، حدیث ۱۵۷۹۔

(۱۷)بخاری محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، کتاب المناقب، باب ویوثرون علی انفسھم، حدیث

(۱۸) اصلاحی امین احسن، تدبر قرآن، فاران فاؤنڈیشن لاہور، جلد ہفتم، نومبر ۱۹۸۲ء، ص ۲۹۵۔۲۹۶۔ شح کے خطرناک پہلو کی وضاحت کے لیے مولانا اصلاحی نے اس کا ترجمہ خودغرض کیا ہے۔ انہوں نے اس کی مزید وضاحت کے لیے ایک حدیث بلاحوالہ نقل کی ہے:

ایاکم والشح فانہ اھلک من کان قبلکم، امرھم بالظلم فظلموا وأمرھم بالفجور ففجروا وأمرھم بالقطعیة فقطعوا۔

(خودغرضی سے بچو! یہی چیز ہے جس نے تم سے پہلے کی قوموں کی تباہ کیا۔ اس نے ان کو ظلم کی راہ سمجھائی تو انہوں نے ظلم کیے، اس نے ان کو فسق وفجور کا حکم دیا تو انہوں نے فسق وفجور کا ارتکاب کیا۔ اس نے ان کو قطع رحم پر ابھارا تو انہوں نے قطع رحم کیا۔)

(۱۹) بخاری محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، کتاب الادب، باب حسن الخلق والسخاء، حدیث ۹۷۴

(۲۰) اصلاحی امین احسن، تدبر قرآن، جلد ہفتم، حوالہ بالا ص ۴۴۴

(۲۱) مودودی سید ابوالاعلی، تفہیم القرآن، جلد ششم، مارچ ۲۰۱۷ء، ص ۳۸۲

(۲۲) ابوداؤد، السنن، کتاب الادب، باب اخبار الرجل الرجل بمحبتہ ایاہ، حدیث ۵۱۲۶، یہ حدیث مسند احمد حنبل ۱۵۶/۵، ۱۶۶ میں بھی موجود ہے اور صحیح الاسناد ہے۔

اسلام پر ہونے والے اعتراضات
...... اوران کا دفاع......

محمد انس فلاحی سنبھلی، اسلامی یونیورسٹی مدینہ منورہ

سوال واعتراض، بحث ومباحثہ اور گفت وشنید صحت مند معاشرے کی علامت ہے۔ یہ سوال وجواب کا سلسلہ حدود وقیود کے ساتھ افہام وتفہیم کی غرض سے ہوتو نفع بخش، اگر اس کا مقصد محض اعتراض برائے اعتراض اور بحث برائے بحث ہوتو معاشرے کی پرامن فضا کو مکدر کرنے میں اس سے زیادہ مضر کوئی چیز نہیں ہے۔ سوال عموماً اشکال کو دور کرنے کے لیے کیا جاتا ہے، اور اعتراض اشکال پیدا کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ سوال ممدوح اور اعتراض مذموم ہے۔

سب سے پہلا سوال فرشتوں نے آدمؑ کی تخلیق کے وقت اللہ سے کیا تھا، ارشاد باری ہے:

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلاَئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الأَرْضِ خَلِيفَةً قَالُواْ أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاء وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لاَ تَعْلَمُونَ۔ (البقرۃ:۳۰)

(پھر اس وقت کا تصور کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ ’’میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں‘‘، انہوں نے عرض کیا: کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خونریزیاں کرے گا؟ آپ کی حمد وثنا کے ساتھ تسبیح اور تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں۔)

اور سب سے پہلا اعتراض ابلیس نے آدمؑ کو سجدہ کرنے کے حکم پر کیا تھا، اس کا تذکرہ سورہ الاسراء میں آیا ہے:

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلآئِكَةِ اسْجُدُواْ لآدَمَ فَسَجَدُواْ إَلاَّ إِبْلِيسَ قَالَ أَأَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيناً۔ (الاسراء:۶۱)

(اور یاد کرو جب کہ ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو،تو سب نے سجدہ کیا،مگر ابلیس نے نہ کیا۔اس نے کہا’’ کیا میں اس کو سجدہ کروں جسے تو نے مٹی سے بنایا ہے؟)

اس کے بعد ہر نبی کی قوم نے نبی کی دعوت پر اعتراض کیا۔ان کا اعتراض یہ تھا کہ اللہ کو ہماری ہدایت مطلوب تھی تو کسی فرشتے کو کیوں نہ بھیجا ہم میں سے ہی ایک شخص کو نبی کیوں بنایا ہے،اس واقعے کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے:

فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ مَا هَذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيدُ أَن يَتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ شَاء اللَّهُ لَأَنزَلَ مَلَائِكَةً مَّا سَمِعْنَا بِهَذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ۔(المومنون:۲۴)

(اس کی قوم کے جن سرداروں نے ماننے سے انکار کیا وہ کہنے لگے کہ’’ یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا۔اس کی غرض یہ ہے کہ تم پر برتری حاصل کرے۔اللہ کو اگر بھیجنا ہوتا تو فرشتے بھیجتا۔یہ بات تو ہم نے کبھی اپنے باپ دادا کے وقتوں میں سنی ہی نہیں(کہ بشر رسول بن کر آئے)۔)

مشرکین مکہ کا اعتراض یہ تھا کہ ہم اس نبی پر ایمان کیوں لائیں اور اپنے آباء واجداد کے دین کو کیوں چھوڑ دیں۔ان کے اس اعتراض کو قرآن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللّهُ قَالُواْ بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءنَا۔(البقرۃ:۱۷۰)

(ان سے جب کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو احکام نازل کیے ہیں ان کی پیروی کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اسی طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے باپ دادا کو پایا ہے۔)

اسلام پر اعتراضات سے کوئی صدی خالی نہیں رہی ہے،معترضین بدلے لیکن اعتراضات وہی رہے۔اسلوب،طریقہ کار اور نوعیت کا فرق رہا۔ان اعتراضات کے علماء اور مفکرین کی جانب سے تسلی بخش اور قابل اطمینان جواب دیے گئے اور دیے جارہے ہیں۔

عصر حاضر میں اسلام پر اعتراضات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ایک اعتراض رفع نہیں ہوتا کہ دوسرا اعتراض آ کھڑا ہوتا ہے۔کبھی جہاد اور اسلامی آتنکواد،حجاب اور تعدد ازدواج اور کبھی کم سنی کی شادی اور جانور کی قربانی پر اعتراض کیا جاتا ہے،یعنی جتنے منھ اتنی باتیں۔یہ اعتراض نئے نہیں ہیں پہلے بھی یہی اعتراض کیے جاتے تھے۔

معترضین دو طرح کے ہیں،ایک وہ جو غلط فہمی کا شکار ہیں۔ان کے سامنے اسلام کی صحیح تصویر پیش نہیں کی جاسکی ہے۔معترضین کی دوسری قسم وہ ہے جو اعتراض برائے اعتراض کرتے ہیں۔یہ اسلام کے

سخت ترین مخالف ہیں۔وہ اسلام اور مسلمانوں کو زچ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ بدقسمتی سے وسائل پر کنٹرول کی وجہ سے یہ بانگ دہل اسلام پر جملے کستے ہیں۔ان کا مقصد صرف اور صرف اسلام کے تعلق سے لوگوں کو خوف وہراس میں مبتلا کرنا ہے۔اور اسلام کی شبیہ کو خراب کرنا ہے تا کہ لوگ اسلام کے دامن رحمت میں جگہ نہ پاسکیں۔یہ لوگ دراصل اسلام اور مسلمانوں کی بڑھتی آبادی سے خوف زدہ ہیں اور مستقبل کے بارے میں فکر مند ہیں۔اس طرح کے لوگ ہر عہد اور ہر زمانے میں رہے ہیں۔ان کے سامنے کتنی ہی وضاحتیں اور صفائیاں پیش کی جائیں ان کی کج فہمی اور ٹیڑھ پن دور نہیں ہوتا۔

معترضین کے اعتراض کا عالم یہ ہے کہ علماء اور مفکرین ہمہ وقت حالتِ دفاع میں رہتے ہیں۔ ہر وقت اسلام اور اسلامی احکام کی وضاحتیں در وضاحتیں کرتے ہیں۔اس کے باوجود قابل ذکر نتیجہ سامنے نہیں آتا۔اسلام پر ہمہ جہت اعتراضات کا ہی نتیجہ ہے کہ ہمارے ایسے مصنفین اور ایسی تحریریں نمودار ہوئیں۔ جنہوں نے اسلام کی شبیہ درست کرنے کی فکر میں نادانستہ طور پر اسلام کی شبیہ خراب کردی۔مسلمہ مسائل میں تاویلات کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسلام فی الواقع ایسا نہیں۔اپنی اس کوشش میں یہ لوگ بلاشبہ مخلص رہے ہیں۔اسلام سے محبت ہی کا نتیجہ ہے کہ وہ اس کی شبیہ خراب ہوتے نہیں دیکھنا چاہتے۔اس لیے وہ اسلام کی ایسی تصویر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔جو اسلام پر ہونے والے اعتراضات کا مسکت جواب ہوسکے اور اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے دنیا کا نقطہ نظر تبدیل کرنے میں مدومعاون ہوسکے۔

مغرب اور دشمنان اسلام کو سب سے زیادہ خوف اسلام کی عسکری قوت سے ہے۔اس لیے انہوں نے جہاد کا سرے سے انکار کرنے کے بجائے ایسی تشریح کی جو متقدمین کی تشریحات سے متصادم ہے۔ دوسرا بڑا خطرہ اسلام سے انہیں یہ ہے کہ اسلام دنیا پر غلبے کی بات کرتا ہے اور نظام کو اپنے تابع کرنا چاہتا ہے۔انہوں نے یہ کہہ کر خطرے کو ٹال دیا کہ اسلام میں غلبہ دین کا کہیں کوئی مطالبہ نہیں ہے۔اسلام تو صرف خدا اور بندے کے درمیان رابطے کا عنوان ہے۔وہ کہتے ہیں کہ اسلام فرد کی اصلاح اور معاشرے کی برائیوں کو دور کرنا چاہتا ہے۔اس نے اسلامی ریاست کے قیام کے لیے کوششیں کرنے کا کوئی مطالبہ نہیں کیا ہے۔

یہ لوگ کتنے ہی مسائل کو اجتہاد کے نام پر متقدمین کی تشریحات سے یکسر مختلف بیان کرنے سے

نہیں چوکے۔اس میں مولانا وحیدالدین خان اور جناب جاوید احمد غامدی صاحبان کا بھی نام لیا جا سکتا ہے، ان کی علمی قدر ومنزلت، وسعتِ مطالعہ اور اسلوب میں ندرت اور جدت سے کسی کو انکار نہیں ہے۔لیکن ان کا فکری اثاثہ کسی اور ہی اسلام کا تصور پیش کرتا ہے۔دونوں میں مکانی بعد کے باوجود فکری قربت اور مطابقت بہت زیادہ ہے۔اول الذکر نے اپنی تصنیفات اور ''الرسالہ'' میگزین کے ذریعے اپنے مشن کو خوب پھیلایا ہے۔ایک بڑا طبقہ کا ان کے معتقدین پایا جاتا ہے۔ثانی الذکر اس وقت عصری تعلیم یافتہ طبقے میں بے حد مقبول ہو رہے ہیں۔ان کے فالوورس کی تعداد میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے۔ان کے ویڈیوز سوشل میڈیا پر کافی وائرل ہوتے ہیں اور بڑی دلچسپی سے سنے اور شیئر کیے جاتے ہیں۔جاوید احمد غامدی صاحب کے علمی اور فکری سرمایے میں بہت تضاد پایا جاتا ہے۔وہ اپنی بات جس قطعیت اور حتمی انداز میں بیان کرتے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہے۔اپنے آراء میں وہ انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کو پڑھنے یا سننے والا کنفیوژن کا شکار رہتا ہے۔

یہ دونوں ہی حضرات اسلام اور مسلمانوں کی شبیہ مغرب اور دشمنان اسلام کے سامنے صحیح پیش کرنے کی کوشش میں اسلام کے مسلّمہ اصولوں پر تیشہ چلانے سے نہیں چوکتے۔اور اسلام کا ایسا تصور پیش کر رہے ہیں جس سے اسلام سے دشمنانِ اسلام کو کسی قسم کا خطرہ محسوس نہ ہو۔اسی لیے یہ کہتے ہیں کہ غلبہ دین اور اسلامی ریاست کے قیام کی کوشش کے لیے شریعت نے کوئی مطالبہ نہیں کیا ہے۔حالانکہ یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ اسلام اقامتِ دین کا مطالبہ کرتا ہے۔اگر اسلام کے تصور اقامتِ دین کو ختم کر دیا جائے تو اسلام نامکمل رہ جاتا ہے۔اسلام خدائی ہدایات پر مبنی نظام کا مطالبہ کرتا ہے، جہاں فرد اور معاشرے کی اصلاح کے ساتھ ساتھ ریاست کا نظام بھی خدائی ہدایت کے مطابق چلا کرے۔اسلام زمین پر خدا کی حکمرانی چاہتا ہے۔اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ ارض اللہ پر حکم اللہ ہی چلے گا، غلبہ رہے گا تو اسلام کا ہی رہے گا۔حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ: ''الاسلام یعلو ولا یعلی علیہ'' (صحیح بخاری باب اذا اسلم الصبی فمات،ھل یصلی علیہ) ''اسلام غالب ہوگا مغلوب نہیں ہوگا''۔

اسلام پر ہونے والے اعتراضات کا دفاع کرتے وقت حکمت، منطقی اور عقلی انداز ضرور اختیار کرنا چاہیے۔لیکن دفاع کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ سامنے والے کو اسلام سے مطمئن کرنے کے لیے اس کے حساب سے اسلام کی تشریح وتوضیح کی جائے۔اور حکمت کا بھی ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ حالات کے دباؤ اور نزاکت کی وجہ سے سمجھوتہ کرلیا جائے۔یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ سامع پر اتمامِ حجت

ضرور ہو البتہ اسے اسلام کے لیے قائل کرنے میں کسی حد سے تجاوز نہ ہو۔

المیہ یہ ہے کہ حالات کی نزاکت، مغرب سے خوف اور مرعوبیت کی وجہ سے جدید اسلام کی تشکیل جدید کی جارہی ہے۔ جو ہر ایک کے لیے قابل قبول ہو جسے کفر بھی تسلیم کرے اور مسلمان بھی، اور کفر کی برتری رہے تو رہا کرے لیکن مسلمانوں کو کفر سے کسی مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ لیکن اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ دشمنان اسلام، اسلام اور مسلمانوں سے اس وقت تک خوش نہیں ہوسکتے جب تک وہ ان کے دین کی پیروی نہ کرنے لگیں۔ ارشاد باری: وَلَن تَرْضَى عَنكَ الْيَهُودُ وَلاَ النَّصَارَى حَتَّى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ۔ (البقرۃ: ۱۲۰) ''یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کے طریقے پر نہ چلنے لگو''۔

اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام کو من وعن پیش کیا جائے۔ اسلام دین فطرت ہے، یہ سلیم الفطرت لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اسلام سب سے تیزی سے پھیلنے والا مذہب ہے۔ جو لوگ اسلام کو قبول کررہے ہیں وہ اس کے مکمل اور ہمہ گیر نظام ہونے کی وجہ سے قبول کر رہے ہیں۔ اگر دین کی تشریح میں اقامت دین کا انکار کردیا جائے تو اسلام بھی دیگر مذاہب ہی کی طرح ایک مذہب بن کر رہ جائے گا۔

ہجری تقویم
......تاریخ اور اہمیت ......

سراج احمد برکت اللہ فلاحی، نیپال
ای میل:sahmadfalahi@gmail.com

ہجری تقویم کا اسلام اور مسلمانوں سے بہت گہرا تعلق ہے۔ہجری تقویم کو اسلامی تقویم کہنے میں کوئی حرج نہیں۔ نبی مکرم ﷺ کے خطبۂ حجۃ الوداع میں اس کی طرف واضح اشارہ پایا جانا، عمر فاروقؓ کا اسے جاری کرنا، سرکاری مراسلات اور دستاویزات میں اسے لازمی قرار دینا، خلفائے راشدینؓ اور بعد کے دور میں امت کے سواد اعظم کا اسے استعمال کرنا ایسا تاریخی ریکارڈ ہے کہ اس تقویم کو اسلامی تقویم کہنے اور مسلمانوں سے اس کے استعمال کی اپیل میں کوئی جھجک نہیں ہونی چاہیے۔ بلکہ بلا تامل یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اگر مسلمان اس سنہ کا استعمال کریں تو اس کی برکتیں اور فوائد معاشرہ میں دیکھنے کو ملیں گے کیونکہ اس کی حقیقت، خوبیوں اور اچھے اثرات کو دیکھ کر اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس کی حیثیت عام تقویم کی سی نہیں ہے۔

اس تقویم کو ایک لمبے عرصے تک امت مسلمہ نے استعمال کیا ہے لیکن افسوس کہ اپنوں کی بے عملی، تساہل اور باطل کی طویل المدتی منصوبہ بندی کے نتیجے میں اب اس کی وہ حیثیت باقی نہ رہی جو قرون اولیٰ میں تھی۔ امت کی سیادت وخلافت سے محرومی اور سیاسی زوال کا بھی اس میں کسی حد تک دخل ہے کیونکہ جب کوئی قوم کسی خطہ میں غلبہ پاتی ہے تو وہاں کے باشندوں پر اپنے تہذیبی ومعاشرتی بلکہ ہر طرح کے اثرات چھوڑتی ہے۔ امت مسلمہ پر بھی غیروں کی حکمرانی وغلبہ کے نتیجہ میں اس طرح کے اثرات پڑتے گئے حتی کہ ایک صدی سے امت اس المیہ سے دوچار ہے کہ اس کا ایک بڑا طبقہ اس تقویم سے کلیتاً ناواقف ہے، کچھ واقف تو ہیں لیکن ناقابل عمل گردانتے ہیں، بعض ایسے بھی مل جائیں گے جو اس تقویم

سے خوب واقف ہیں، اسے قابل عمل بھی تصور کرتے ہیں البتہ ہجری سن اور تاریخ استعمال کرنے کو عار سمجھتے ہیں اور بعض لوگوں کے یہاں ہجری سنہ کو اتنی اہمیت نہیں کہ اسے استعمال کیا جائے۔

اس مضمون میں کوشش کی جائے گی کہ ہجری تقویم کی حیثیت، اہمیت، ضرورت اور اس کے اچھے نتائج سے آگاہ کیا جائے، اس تعلق سے پائے جانے والے شکوک وشبہات کا ازالہ کیا جائے اور اس تقویم کے امتیازات پر بحث کی جائے۔ ضمناً دیگر کلینڈروں کے استعمال کی بعض قباحتیں بھی بیان کی گئی ہیں تاکہ قارئین کو پورا اطمینان ہو سکے اور شرح صدر کے ساتھ ہجری تقویم کے استعمال کی طرف پوری توجہ دی جائے۔

تقویم کی ضرورت:

اپنی یادداشت کو محفوظ رکھنے، کسی واقعہ کی تحقیق چاہنے، اپنے ارادوں کی تکمیل اور منصوبہ بندی، مذہبی رسوم کی ادائیگی اور اپنی نجی وسماجی ضرورتوں کے لیے زمانۂ قدیم سے انسان ایام وماہ وسال کو یاد کرنے اور حساب رکھنے کا ضرورت مند رہا ہے۔ اسی کو اصطلاح میں تقویم کہا جاتا ہے۔ حبیب الرحمٰن خان صابریؔ نے لکھا ہے: ''معاشرتی ضرورتوں اور مذہبی رسموں کو سامنے رکھ کر دنوں کو زمانوں میں متحد کرنے یا سائنسی احتیاجوں میں ہفتوں، مہینوں اور برسوں کو مجتمع کرنے کے طریقہ کو تقویم کہتے ہیں۔''

(مفتاح التقویم: فقرہ نمبر۲ ص۲۱)

غرض تقویم متمدن قوموں کی اجتماعی زندگی کی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے اس سلسلہ میں باقاعدگی اور نظم کا بھی پتہ چلتا ہے۔ لوگوں نے اپنی دماغی کوششوں سے کچھ قواعد متعین کیے اور حساب رکھنا شروع کیا۔ کسی قابل ذکر واقعہ، اہم حادثہ، قدرتی آفات، کسی بادشاہ کی تخت نشینی، کوئی یادگار تاریخی فتح یا پھر کسی بڑی شخصیت کی تاریخ پیدائش یا یوم وفات کو عموماً لوگوں نے نقطۂ آغاز قرار دیا اور اسی مناسبت سے اس سنہ کو یاد کیا جانے لگا۔ مختلف ملکوں میں مختلف ناموں سے سال اور مہینوں کے حسابی قاعدے اور تقویمیں رائج ہوئیں، البتہ ہر تقویم میں دن، مہینہ اور سال کا تصور پایا گیا۔ اسی طرح سال کا حساب بھی دونوعیّتوں شمسی اور قمری پر منحصر رہا۔ پھر عوام کی نظروں میں وہ متروک ہو گئے۔ انسانی تاریخ میں ہجری تقویم، عیسوی تقویم، مصری، رومی، بابلی، یونانی، عبرانی، اور شک تقویم کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ہمارا اصل موضوع تو ہجری سنہ ہے لیکن عیسوی سنہ سے متعلق مختصر نوٹ پیش کردینا ضروری ہے۔

عیسوی تقویم:

عیسوی تقویم دراصل گریگوری تقویم ہے۔ اسے انگریزی کلینڈر اور تاریخ کے نام سے جانا جاتا

ہے۔اس تقویم میں شمسی سال کا اعتبار ہوتا ہے۔ جب زمین اپنے بیضوی دائرہ پر حرکت کرتے ہوئے سورج کے گرد اپنی گردش مکمل کر لیتی ہے تو سال مکمل ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اس سنہ کا نقطۂ آغاز ہے۔اس تقویم کا استعمال ۱۳۰ھ بمطابق ۷۴۸ء سے شروع ہوتا ہے۔ سال میں بارہ مہینے جنوری، فروری، مارچ......اور ۳۶۵ دن ہوتے ہیں۔البتہ یہ تقویم حقیقی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا حساب ہمیشہ فرضی بنیادوں پر ہوتا ہے۔عیسوی سنہ کے بارے میں تحقیق یہ ہے کہ یہ پرانے رومی کلینڈر سے ترمیم شدہ ہے۔ جسے اگٹس نے ترمیم کیا پھر جولین نے ترمیم کیا۔ اس طرح کئی بار اس کی ترمیم ہوئی۔آخری ترمیم پاپائے گریگوری کے حکم سے ۱۵۸۲ء میں ہوئی اور یہی ترمیم شدہ کلینڈر آج عیسوی سنہ کے نام سے جاری ہے۔

عبدالقدوس ہاشمی نے امریکن پیپل انسائیکلو پیڈیا مادہ 'کلینڈر' کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''جولین کے چھ سو سال بعد ایک عیسائی راہب ڈینس ایگزیگویس نے اسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف غلط حساب کر کے منسوب کر دیا تھا۔اسی وقت سے اسے مسیحی کلینڈر کہا جانے لگا۔ ورنہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اس کا حقیقت میں کوئی تعلق نہیں۔(تقویم تاریخی، سنہ عیسوی) مفتاح التقویم میں ہے کہ ''عیسوی سنہ کو ایگزیویس نے ایجاد کیا اور بیڈی نے اسے ہردلعزیز بنایا تھا۔عیسوی سنہ کا پہلا مہینہ اور پہلی تاریخ مختلف ملکوں میں مختلف ہوا کرتی تھی۔ گریگوری تقویم کے اجرا کے ساتھ قانوناً سرکم سائزن اسٹائل جاری ہوئی جو یکم جنوی کو شروع ہوتی ہے۔'' (مفتاح التقویم، فقرہ ۴۰، ص ۳۳) عیسوی سنہ کا رومی تقویم سے بہت گہرا تعلق ہے۔ بلکہ یہ رومی تقویم کی تصحیح کردہ تقویم ہے۔اس اعتبار سے اسے قدامت حاصل ہے۔ قبل مسیح بھی رومی تقویم کا پتہ چلتا ہے۔البتہ بار بار ترمیم کی ضرورت اور مختلف ملکوں مختلف قواعد لوند، کسر اور الگ الگ مبدأ کی وجہ سے اس قدامت کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی ہے۔موجودہ عیسوی سنہ گریگوری کلینڈر ہے جو بہت بعد کی ترمیم و ترویج ہے۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ ۷۴۸ء سے اس سنہ کے استعمال کا پتہ چلتا ہے خواہ اس کی شکل اور نوعیت کچھ بھی رہی ہو۔

قطع نظر اس کے کہ عیسوی سنہ غلط اور اپنے اصل کے اعتبار سے فرضی بنیادوں پر قائم ہے۔لیکن آج اپنے عروج پر ہے اور اکثر ممالک میں اس کا استعمال ہو رہا ہے۔ ہر طرح کے ضروری قواعد مرتب ہو چکے ہیں۔ ماضی کی کوئی تاریخ، دن اور سال معلوم کرنا یا کسی دوسرے سنہ سے تبدیل کرنا یا اس کے برعکس دیگر سنین کو اس سنہ میں معلوم کرنا یا پھر اس کی تصحیح کے لیے لیپ سال یا صدی، عدم لیپ وغیرہ کے

تفصیلی قواعد وضوابط مرتب ہو چکے ہیں۔

ھجری تقویم:

سن ہجری دنیا کے رائج سنین اور تقویموں میں ایک بہت ہی معروف ومشہور تقویم ہے۔اس کا نقطۂ آغاز دنیا کی عظیم ہستی اوراللہ کے آخری نبی محمدﷺ کا اہم ترین سفر ہجرت ہے۔جواذن الٰہی کی تعمیل، آپﷺ کی سیرت کا نمایاں باب اورتاریخ انسانی کا ایک قابل ذکر موڑ ہے۔

اس سنہ کا آغاز یکم محرم الحرام بروز جمعۃ المبارک ۱ھ مطابق ۱۶/ جولائی ۶۲۲ء ہے۔ یہ سنہ فطری اور حقیقی ہے۔اس لیے قمری ہجری سنہ میں کوئی ماہ کبیسہ نہیں ہوتا ہے۔آپؐ نے خطبۂ حجۃ الوداع میں فرمایا تھا:

"ایھا الناس انما النسیء زیادة فی الکفر یضل به الذین کفروا یحلونه عاما ویحرمونه عاما لیواطئوا عدة ما حرم الله فیحلوا ما حرم الله وحرموا ما احل الله وان الزمان قد استدار کھیئته یوم خلق السمٰوات والأرض وانَّ عدَّة الشھور عندالله اثنا عشر شھرا فی کتاب الله یوم خلق السماوات والارض منھا أربعة حرم، ثلاثة متوالیة ذوالقعدة وذوالحجة ومحرم ورجب مضر الذی بین جمادی وشعبان .(تاریخ طبری جلد سوم ص ۱۵۰)

(اے لوگو! نسی کفر میں اضافہ ہے، یہ کافروں کو گمراہ کرنے کے لیے ہے۔کسی سال اس کو حلال ٹھہراتے ہیں اور کسی سال حرام کہ اللہ کے حرام کیے ہوئے مہینوں کی گنتی پوری کر کے اس کے حرام کیے ہوئے کو جائز بنالیں اور جائز حرام کرلیں۔اب زمانہ پھر گھوم گھوما کر صحیح وقت اور اصل صورت پر آ گیا ہے۔جیسا کہ وہ تخلیق کائنات کے دن تھا۔مہینوں کی تعداد اللہ کے یہاں نوشتۂ الٰہی میں جس دن سے اس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا بارہ مہینے ہیں۔سنو! اب آئندہ نہ کبیسہ ہوگا نہ نسی ہوا کرے گی۔ چار مہینے حرمت والے ہیں، تین پے در پے اور ایک رجب کا مہینہ ہے جو جمادی الاخری اور شعبان کے بیچ میں ہوتا ہے۔)

(صحیح بخاری بروایت ابی بکرہ: حدیث ۴۶۶۲، ۳۱۹۷، ۴۴۷۷، مسلم: ۴۳۸۳، ابوداؤد ۱۹۴۷)

یہی فرمان رسولﷺ ہجری سنہ کا مصدر ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے اسلامی تقویم کی ندرت یہ ہے کہ یہ فطرت سے ہم آہنگ اور ہر سال کبیسہ کے بغیر ۱۲/ مہینوں کا ہوتا ہے۔رویت ہلال کی شام سے مہینہ شروع ہوتا ہے۔اسلام کے تمام مذہبی امور کی انجام دہی کا مدار قمری تاریخوں پر ہے۔

ہجری سنہ کا آغاز :

دین اسلام نے اپنے متبعین کو ہر باب میں رہنمائی دی ہے۔ اس نے انہیں جاہلیت کی تاریکیوں سے نکال کر صراط مستقیم پر گامزن کر دیا اور وہ تمام روزن بند کر دیے جہاں سے جاہلیت کے گھسنے کا امکان ہوسکتا تھا اور مسلمانوں کو یہ تصور دیا کہ انہیں اپنا دین و ایمان عزیز رہے۔ آغاز ہی میں مکی سورتوں میں حکم دیا کہ اسلامی تعلیمات پر سختی سے عمل کرو اور مشرکین کے طرز حیات سے دور رہو۔ ''ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار . (ھود:۱۱۳)

ان ہدایات کی تعمیل میں جب کوئی صحابی اسلام کا اعلان کرتا تو صرف دین اسلام کا ہوکر رہ جاتا اور جاہلیت کی تمام چیزوں کو خیر باد کہہ دیتا حتی کہ معمولی چیزیں جن کی کوئی حیثیت نہ تھی، ان سے اپنے آپ کو دور رکھا جاتا۔ تاریخ اور سنین کے استعمال میں بھی صدر اول کے مسلمانوں کا یہی عمل تھا۔ اسی لیے شروع سے ہی عہد رسول ﷺ میں مسلمان خاص خاص واقعات سے اپنے سالوں کو موسوم کیا کرتے تھے۔ حالانکہ عربوں میں سنین کا تصور بالکل مفقود نہ تھا۔ بلکہ مشرکین مکہ عام الفیل اور یہودی بیت المقدس کی تباہی کے واقعہ سے تاریخ اور سال شمار کرتے تھے۔ سنہ اذن، سنہ امر بالقتال، سنہ تمحیص، سنہ ترفئہ، سنہ استغلاب، سنہ استوار، سنہ برأت، اور سنہ وداع وغیرہ سنین کے استعمال کا پتہ روایات سے چلتا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ سب سنوں کا تعلق دعوت دین کے اہم واقعات و مراحل سے ہے، یہ کسی شخصیت کی طرف منسوب نہیں۔ یہی اسلام کا مزاج ہے کہ وہ کسی شخصیت کی تاریخ نہیں ایک طریق زندگی ہے۔

لیکن سنین کا یہ تسلسل کب تک چلتا اور کیسے یاد رکھا جاتا؟ چنانچہ عہد فاروقی میں صحابہؓ نے اس طرف توجہ دی۔ عمر فاروقؓ کی ایماء پر اکابر صحابہؓ کی نشست ہوئی، اسلامی تقویم کا ایجنڈا پیش ہوا، حضرت علیؓ کی فراست نے ہجرت نبوی ﷺ کو نقطۂ آغاز اور حضرت عثمانؓ نے محرم الحرام کو پہلے مہینہ کی حیثیت سے باقی رہنے کا مشورہ دیا اور سب کے اتفاق سے فیصلہ ہوا۔ خلیفۂ ثانی عمر فاروقؓ نے اس کے استعمال کو لازم کر دیا اور اس طرح صحابہؓ کے اتفاق سے ہجری سنہ کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ یہ فیصلہ یوم الخمیس ۳۰/جمادی الثانیہ ۱۷ھ کو ہوا۔ (رحمۃ للعالمین جلد دوم ص ۴۵۰)

البتہ بعض محققین کا اصرار ہے کہ سنہ ہجری کی ابتداء نبی ﷺ کے حکم سے ہو چکی تھی۔ مدینہ منورہ میں تشریف لانے کے بعد ہی آپ ﷺ نے تاریخ لکھنے کا حکم دیا تھا۔ دوبارہ خطبۂ حجۃ الوداع ۱۰ھ میں

آپ ﷺ نے اعلان کیا، اسی وقت سے ہجری سنہ کا استعمال ہوا، بعد میں حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے عہد خلافت میں بعض عوامل کے پیش نظر سرکاری حکم کے تحت اس کو لازم کر دیا کہ سرکاری مراسلات و بین الاقوامی معاملات میں سنہ ہجری کا استعمال ہونا چاہیے۔ (تاریخ ابن عساکر ج ا ص ۳۱، صبح الاعشیٰ ج ۶ ص ۲۴۰، کتاب الشماریخ فی علم التاریخ الباب الاول، تقویم تاریخی عبدالقدوس ہاشمی، نقوش سیرت نمبر ج ۲ ص ۱۱۸، بحوالہ طبری دوم، ندائے خلافت ۴ محرم ۱۴۲۵ھ)

سیوطیؒ نے ابن شہاب کے حوالے سے اس روایت کو نقل کر کے راجح قرار دیا ہے۔ (دیکھیے کتاب الشماریخ) لیکن ابن حجر نے اس روایت کو معضل کہا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ راجح یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے ہجری سنہ کا تقرر فرمایا ہے۔ (فتح الباری ج ۷، ص ۲۶۸ باب التاریخ ومن این ارخوا التاریخ)

سنہ ہجری کی اہمیت وضرورت:

ہجری تقویم اسلامی تقویم ہے۔ اس کا تعلق اسلامی تاریخ اور تہذیب اسلامی سے ہے۔ اس کا سلسلہ صحابہؓ، خلفائے راشدینؓ اور نبی ﷺ تک پہنچتا ہے۔ کتب تاریخ وسیرت اور کتب تفاسیر واحادیث میں اسی سنہ کا استعمال ہے۔ نبی ﷺ اور اپنے اسلاف صحابہؓ وتابعین سے حقیقی واقفیت کے لیے اور اسلامی تاریخ جاننے کے لیے اس سنہ کا استعمال اور اس کی واقفیت ضروری ہے۔ ہجری تقویم قمری بنیاد پر قائم ہے۔ قرآن مجید میں چاند کا ایک فائدہ "لتعلموا عدد السنین و الحساب" بتایا گیا ہے۔ (یونس: ۵، توبہ: ۳۷) یہ تقویم اس آیت سے مناسبت رکھتی ہے۔

خلفائے راشدین سے لے کر عہد بنوامیہ، بنوعباس، عہد عثمانی تک تمام مسلمانوں کا تعامل اسی پر سرکاری وعوامی سطح پر رہا ہے اور اسی سنہ کا زور رہا ہے۔ بلکہ مسلمانوں کے دور عروج میں سنہ ہجری کو بین الاقوامی حیثیت حاصل تھی۔ دسویں صدی عیسوی سے پہلے تک دیگر قوموں نے بھی اس کا استعمال کیا ہے۔ اس وجہ سے یہ تقویم اسلامی تہذیب کا حصہ اور مسلمانوں کی علامت بن گئی ہے۔ سنہ ہجری کے بغیر اسلامی تہذیب، اسلامی ریاست اور مسلمان معاشرہ کا تصور نہیں رہتا بلکہ یہ لازم وملزوم کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔

اہل باطل کی وہ چیزیں جو ان کی علامت بن چکی ہوں، شعائر کا درجہ رکھتی ہوں، ان کی تہذیب اور ان کے رسم ورواج کا جز بن جائیں ان کا استعمال نہ کرنا اور ان سے حتی الامکان اجتناب کرنا اسلام کی تعلیم اور ایمان کی دلیل ہے اور یہ مطلوبہ عمل اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ ہمیں اپنا متاع دین وایمان عزیز تر ہے

کیونکہ باطل سے قریب ہونے کی صورت میں ان کے اثرات کسی نہ کسی شکل میں ضرور پڑتے ہیں۔اسی لیے امت کو دوسروں کی نقالی سے روکا گیا ہے۔''من تشبه بقوم فهو منهم''۔(ابوداؤد کتاب اللباس ح۴۰۳۱) دیگر احادیث میں اس کی اسی طرح تلقین کی گئی ہے۔ان احادیث کی تعمیل اور تقاضے کے طور پر بھی ہم کو سنہ ہجری کے استعمال پر زور دینا چاہیے۔غیر اسلامی تہذیبوں اور ان کے اختلاط و اثرات سے بچنے میں ہجری سنہ کا استعمال بھی کسی حد تک معاون ہوسکتا ہے۔

سنہ ہجری کا نقطۂ آغاز ہجرت نبوی ﷺ ہے۔ہجرت اسلامی تاریخ کا ایک اہم موڑ ہے۔ بلکہ حق و باطل کی کشمکش اور اسلامی انقلاب کی جدوجہد میں ہجرت کو ایک مقام حاصل ہے۔ہجرت ایک عبادت، انبیاء کی سنت، دعوت دین کا ایک مرحلہ، حکمت دین کا ایک گوشہ، اور تحریکی پالیسی کی ایک حساس دفعہ ہے۔ہجرت کی اپنی تاریخ ہے، اس کے پیچھے متعدد حکمتیں، قیمتی دروس وعبرت اور دوررس اثرات ہیں۔ ہجری سنہ کا استعمال کرنے کی صورت میں یہ تجسس ضرور پیدا ہوگا کہ ایک مسلمان معلوم کرے کہ ہجرت کا مقام ومرتبہ کیا ہے؟ ہجرت کیوں کی جاتی ہے؟ صحابہ کرامؓ نے مدینہ ہجرت کیوں کی تھی؟ ہجرت کے وقت کن چیزوں کا خیال رکھا جاتا ہے؟ ہجرت کا اصل مقصد کیا ہوتا ہے؟ ہجرت میں ہمارے لیے کیا سبق ہے؟ کیا آج بھی ہجرت کا مطالبہ ہوسکتا ہے؟ اس طرح ہجری سنہ تعلیم وتحریض کا انتہائی اہم ذریعہ بھی ہے۔

اسلامی تقویم کا آغاز واقعہ ہجرت سے کیوں؟

ہجرت کو تقویم اسلامی میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔اس کا آغاز ہجرت سے ہوتا ہے۔آغاز تقویم یا اس کی نسبت کے لیے ولادت نبوی، بعثت نبوی، یوم بدر، یا فتح مکہ وغیرہ کو بھی اہمیت دی جاسکتی تھی لیکن ہجرت کے انتخاب میں کیا پیغام ہے؟

اس کے جواب میں میں ہمارے دور کے معروف اسلامی مصنف سید اسعد گیلانیؒ رقم طراز ہیں:

''حضور اکرم ﷺ کی عظیم اسلامی تحریک کی جدوجہد میں واقعہ ہجرت بظاہر تو ایک ناخوشگوار واقعہ ہے لیکن حقیقتاً یہ اسلامی انقلاب کی طرف ایک اہم پیش قدمی ہے۔مسلمانوں نے اسی لیے اپنی تقویم کو کسی شخصیت، خاندان یا قوم کی طرف نسبت دینے کے بجائے ایک نظریہ کی جدوجہد کے ایک مخصوص مرحلے سے نسبت دی ہے۔مسلمانوں کا سنہ سنہ ہجری ہے جو ہجرت کے واقعہ سے شروع ہوتا ہے چنانچہ ہر دفعہ جب مسلمان اپنے سالِ نو کا آغاز کرتے ہیں تو یہ اپنی تاریخ کی عظیم ترین اسلامی تاریخ کی بھرپور جدوجہد کے لیے ایک ایسے مرحلے کی یاد تازہ کرتے ہیں جب وہ کسمپرسی اور جبروتشدد کے ماحول سے نکل

کر ایک اسلامی ریاست کے قیام کے مرحلے میں قدم رکھ رہے تھے...... یہ اللہ کی حکمت ہے کہ ہجرت کی تاریخ نئے سال کی یکم تاریخ کے ساتھ اس طرح منطبق ہوگئی کہ ہجرت ہی مسلمانوں کے لیے سال نو کا موضوع بن کر رہ گئی ہے۔ ....اس طرح جب مسلمان اپنے سال نو کا آغاز کرتے ہیں تو وہ اپنے آپ کو ایک نظریاتی گروہ کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ بلا شبہ ہجرت مدینہ کا واقعہ اپنی تاریخی اہمیت کے لحاظ سے فتح مکہ سے کسی صورت کم نہیں ہے بلکہ شاید کچھ زائد ہی ہے۔ جس روز ہجرت کر کے مکہ چھوڑا جا رہا تھا، اسی روز تاریخ کے ایوان میں مکہ کی فتح کا سنگ بنیاد رکھا جا رہا تھا۔'' (ہجرت رسول ﷺ سید اسعد گیلانیؒ، نقوش سیرت نمبر ج ۸، ص ۲۵۰۔۲۵۱)

حضرت عمرؓ کا قول جو براہ راست اس مسئلہ سے متعلق ہے قابل ذکر ہے۔ اس مقصد کی خاطر صحابہؓ کی جو نشست منعقد ہوئی، اس میں جب حضرت علیؓ نے ہجرت کو مبدأ تاریخ قرار دینے کا مشورہ دیا تو حضرت عمرؓ نے یہ کہتے ہوئے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا:

''لا بل نورخ بمهاجر رسول الله ﷺ فان مهاجره فرق بين الحق والباطل''

(ہجرت حق اور باطل کے درمیان فارق کی حیثیت رکھتی ہے لہٰذا اسی کو تاریخ اور سنہ کے لیے ہم مبدأ مقرر کریں گے۔ ابن عساکر جلد اول ص: ۳۵، الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ ص: ۱۴۲)

قابل غور بات ہے کہ صحابہ کرامؓ نے ہجرت کا انتخاب کیوں کیا؟ جو بظاہر درماندگی، شکست اور مجبورانہ اقدام سے عبارت ہے۔ انہوں نے دیگر قوموں کی طرح فتح وظفر کو مبدأ تاریخ کیوں نہیں بنایا؟ حقیقت ہے کہ حق کا معیار باطل کے معیار سے قطعاً مختلف ہے۔ اسلام میں اصل مقصود فلاح آخرت ہے جبکہ باطل کے عزائم کا منتہی مادی غلبہ اور دنیاوی فتح وغلبہ کے بعد ایک نئی آزمائش کا باب وا ہوتا ہے۔

ہجرت دعوت دین کی ذمہ داری اور فریضہ استقامت میں اہل دعوت کی کامیابی کا خدائی سرٹیفکٹ ہے کیونکہ ہجرت کا فیصلہ محض اذیتوں سے گھبرا کر مجبوراً یا جلد بازی میں نہیں لیا گیا تھا بلکہ اللہ کے اذن سے ہجرت مدینہ ہوئی اور یہ اذن خاص دعوت دین کا حق ادا کرنے اور صبر واستقامت کے ساتھ حجت تمام کر دینے کے بعد ہی ملتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہجرت مکمل تائید الٰہی کا مظہر ہے۔ کلمہ باطل کی شکست اور کلمہ حق کے فتح کی علامت بھی ہے۔

''الاتنصروه فقد نصره الله اذ اخرجه الذين كفروا ثانى اثنين اذهما فى الغار اذ يقول لصاحبه لا تحزن ان الله معنا فانزل الله سكينته عليه وايده بجنود لم تروها

وجعل کلمة الذين کفروا السفلی وکلمة الله هی العليا والله عزيز حکيم". (التوبة: ۴۰)

(تم نے اگر نبی کی مدد نہ کی تو کچھ پروانہیں، اللہ اس کی مدد اس وقت کر چکا ہے جب کافروں نے اسے نکال دیا تھا، جب وہ صرف دو میں کا دوسرا تھا، جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ ''غم نہ کر'' اللہ ہمارے ساتھ ہے، اس وقت اللہ نے اس پر اپنی طرف سے سکون قلب نازل کیا اور اس کی مدد ایسے لشکروں سے کی جو تم کو نظر نہ آتے تھے۔ اور کافروں کا بول نیچا کر دیا۔ اور اللہ کا بول تو اونچا ہے ہی، اللہ زبردست اور دانا و بینا ہے۔)

سنہ ہجری کے استعمال کی آسان صورتیں:

ہجری تاریخوں کے استعمال میں حقیقتاً کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ ہجری سنہ ہمارے یہاں رائج نہیں ہے ورنہ یہ فطرت سے اس قدر ہم آہنگ اور آسان ہے کہ ہر فرد اس سے بخوبی واقف ہوتا اور عام شخص کو بھی اس مسئلہ میں کسی تفہیم کی ضرورت نہ ہوتی۔

ہجری سنہ کے استعمال کا طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ رویت پر اعتماد کر کے ہر ماہ یکم تاریخ کا فیصلہ ہو اور پورے مہینے اس کا استعمال ہو۔ اس کی تاریخوں میں عالمی یکسانیت ضروری نہیں ہے البتہ مطلع کی حد تک روئت ہلال کمیٹیوں کی تشکیل ہو وہ فیصلہ لیں اور بروقت اعلان کا انتظام کریں۔ انگریزی تاریخ ہر خاص و عام استعمال کر رہا ہے اور کوئی آدمی معاشرہ سے الگ نہیں رہ سکتا ہے۔ لہٰذا ہجری تاریخ کے ساتھ ضرورتاً دن کی وضاحت بھی ہوتا کہ تقابل میں آسانی بھی ہو۔ آج کی موجودہ صورتحال میں انگریزی تاریخوں کا استعمال ناگزیر ہے۔ لیکن اصول یہ ہو کہ ہجری تاریخ کو مقدم رکھا جائے پھر آگے عیسوی تاریخ کی وضاحت ہو۔ ''**يريد الله بكم اليسر ولا يريد بكم العسر**'' البقرۃ: ۱۸۵)

اسی طرح جہاں ہجری تاریخوں کے استعمال میں کوئی رکاوٹ نہ ہو وہاں ہجری تاریخ کا استعمال ضرور کیا جائے۔ ایسا نہ ہونے پائے کہ اس کے استعمال میں ہم خود رکاوٹ بن جائیں۔ مثلاً نجی ضرورتوں، ڈائری، حساب وکتاب، اور خطوط وغیرہ میں استعمال کریں۔ اسلامی مدارس وجامعات، تنظیموں اور اصلاحی ودعوتی جماعتوں کو چاہیے کہ جس حد تک اس کا استعمال کر سکتے ہوں ضرور کریں۔ مدارس وجامعات میں وسیع پیمانے پر اس کا استعمال بآسانی ممکن ہے اور بہت مفید بھی ہوگا۔ اپنا کلینڈر تیار کرتے وقت اس بات کا اہتمام ہو کہ ہجری تاریخوں کو فوکس کیا جائے اور ہجری کلینڈر تیار کیا جائے

جس میں عیسوی تاریخوں کو ضمناً شامل رکھا جائے۔

ہجری سنہ سے متعلق بعض شبہات کا ازالہ:

ہم جس خطۂ ارض میں رہتے ہیں وہاں عیسوی سنہ کا استعمال ہے۔ خط وکتابت اور عام بول چال سے لے کر اخبارات، سرکاری وغیر سرکاری اعلانات میں اسی کا استعمال ہے۔ ہجری سنہ کو نہ کوئی استعمال کرتا ہے اور نہ کسی کو استعمال کرتے دیکھتا ہے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ہے جس کو نہ صرف یہ کہ ہجری مہینے اور اس کی تاریخ کا علم نہیں ہوتا ہے بلکہ اکثر وبیشتر کو ہجری سال کا بھی پتہ نہیں ہوتا، عوام تو عوام خواص کا بھی اس سے استثنا نہیں ہے۔ اس سے بھی آگے اسے نا قابل استعمال سمجھنا، اس میں نقص محسوس کرنا اور اس کے بعض مسئلوں کو نا قابل حل سمجھنا، عام خیال ہے۔ ذہنوں میں اس کے تعلق سے کچھ شبہات ہیں حالانکہ ان کی کوئی حقیقت نہیں۔

ا۔ ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ ہجری سنہ میں رویت ہلال سے تاریخوں کا تعین ہوتا ہے اختلاف مطالع اور اختلاف رائے کے نتیجے میں تاریخوں میں یکسانیت ناممکن ہے۔

یہ غلط فہمی اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ آج چونکہ اسلامی تہذیب کا دور دورہ نہیں ہے، میڈیا اور ذرائع ابلاغ پر مسلمانوں کا قبضہ نہیں ہے۔ ہر طرف اور ہر چیز میں انگریزی تاریخوں کا استعمال عام بلکہ لازمی بنا دیا گیا ہے۔ اس لیے سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے کہ آخر ہجری کلینڈر کو رواج دینے کی صورت میں جب ہم رویت کو حتمی اور فیصلہ کن قرار دیں گے تو پھر رویت کی تعیین کا مسئلہ ہوگا۔ ہر ماہ یکم تاریخ کی تعیین اور لوگوں کو اس کا علم کیسے ہوگا۔ جبکہ تاریخ کا یہ قضیہ اتفاق کا طالب ہے۔

اسلامی تعلیمات کا تفصیلی مطالعہ کریں اور باریک بینی سے جائزہ لیں تو جہاں یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ دین اسلام میں اس بات کی صلاحیت ہے کہ انسانی زندگی کے مختلف ادوار کا ساتھ دے سکے، اس کی تعلیمات اور احکام پر عمل کرنا، ہمہ وقت ممکن ہے اور تبدیلی زمان ومکان اس میں رکاوٹ نہیں بن سکتی ہے۔ وہیں یہ بات بھی آشکارا ہوتی ہے کہ اسلامی تعلیمات کی روح غلبہ وتفوق ہے، یہ اپنے مخاطب کو غالب قوم کی حیثیت میں دیکھنا چاہتی ہے اور اس صورت میں مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ ہمارے پاس زمانے کے تمام ممکنہ ذرائع ابلاغ ہوں گے۔ رویت ہلال کی ریاستی کمیٹی غروب آفتاب کے چند منٹوں بعد آپ تک خبر نشر کردے گی۔ گھر بیٹھے ٹیلی ویژن، ریڈیو، اور دیگر ممکنہ ذرائع سے فوراً اطلاع ہو جائے گی۔

۲۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سنہ ہجری کی تاریخوں میں تفاوت ہوتا ہے۔ سعودی عرب میں آج عید ہے

تو ہمارے یہاں کل عید ہوگی ، پرسوں کہیں اور۔عیسوی سنہ کی طرح ہجری تاریخوں میں یکسانیت ہونی چاہیے۔آج یکم مارچ ہے تو ہرجگہ یہی تاریخ ہوتی ہے خواہ ہندوستان ہو یا مغربی مما لک۔

یہ شبہ لاعلمی پر مبنی ہے۔زمین کی گولائی، اس کی محوری گردش اور چاند کے مطالع مختلف ہونے کی وجہ سے جب پوری دنیا میں ایک ساتھ صبح وشام نہیں ہوتے تو پھر تاریخ میں کیونکر یکسانیت ہوسکتی ہے۔رات کے بارہ بجتے ہی ہمارے یہاں انگریزی کی اگلی تاریخ شروع ہوجاتی ہے جبکہ مغرب کے وہ علاقے جہاں دس گیارہ گھنٹے بعد سورج طلوع ہوتا ہے ابھی پچھلی تاریخ ہی رہتی ہے۔گویا عیسوی تاریخ ہمارے یہاں پہلے اور ان مما لک میں بعد میں شروع ہوتی ہے جہاں سورج بعد میں طلوع ہوتا ہے۔اسی طرح ہجری تاریخ کا آغاز سعودی عرب اور ان مما لک میں مقدم ہے جہاں غروب آفتاب پہلے ہوتا ہے معلوم ہوا کہ تفاوت کا یہ مسئلہ صرف ہجری سنہ میں نہیں بلکہ دنیا کے ہر کلینڈر میں پایا جاتا ہے۔

دوسرے اس کی حکمت یہ ہے کہ رب کی کبریائی اور اس کی عبادت چند لمحے میں ختم نہ ہوجائے بلکہ مختلف مما لک کے مسلمان مختلف اوقات وایام میں عید منا کر کئی روز تک اپنے رب کی کبریائی کا اعلان کرتے رہیں۔یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ہر وقت کہیں نہ کہیں نماز ہوتی رہتی ہے۔اور دن کا کوئی گھنٹہ ایسا نہیں گزرتا کہ اللہ کے کچھ بندے اس کی اطاعت میں نماز نہ قائم کررہے ہوں۔

۳۔ایک شبہ یہ پیدا کیا جاتا ہے کہ انگریزی تاریخ کی طرح ہجری تاریخ پہلے سے متعین نہیں ہوتی ہے۔کوئی پروگرام طے کرتے وقت اس کا استعمال نہیں ہوسکتا ہے۔

انگریزی تاریخ کی طرح ہجری تاریخ بھی اگر پہلے سے متعین رہا کرتی تو کوئی اللہ کی نشانی چاند دیکھ کر اللہ کو یاد نہ کرتا، اپنے سارے نظام کو فطرت سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش نہ کرتا، شعائر کی حرمت نہ ہوتی اور پہلے سے تیاری اور شوق کا مظاہرہ نہ ہوتا۔رمضان المبارک کے روزے، عیدالفطر، عیدالاضحیٰ، صوم یوم عاشوراء اور دوسرے نفلی عبادات وغیرہ۔گویا ہم کو چاند دیکھ کر روزہ رکھنا تھا، نہ کہ ہم پہلے سے کوئی متفقہ فیصلہ لے لیتے کہ ہاں فلاں دن عید منائیں گے۔وقت تکوینی نظام کا حصہ ہے، گویا اس طرح ہم کو یاددہانی ہوتی رہتی ہے کہ ہم مکمل اللہ کے تابع ہیں اور اپنی مرضی سے کوئی فیصلہ لینے کے مجاز نہیں ہیں۔

۴۔بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہجری سنہ کا استعمال نہیں ہے ہر جگہ انگریزی تاریخوں کا استعمال عام ہے، پھر آخر ہجری سنہ کے استعمال کی بات کہاں تک معقول ہے؟

اس سلسلہ میں عرض ہے کہ ہجری سنہ کی حیثیت، اہمیت اور ضرورت کا تذکرہ پیچھے آچکا ہے، اب

اگر اس سنہ کا استعمال نہیں ہے تو کسی چیز کا استعمال میں نہ ہونا، اس بات کی دلیل نہیں کہ اس کا استعمال نہیں ہوسکتا ہے اور نہ اس کے استعمال کی ضرورت ہے۔ یہاں ہجری سنہ کا استعمال نہیں لیکن بہت سے عرب ممالک میں آج بھی ہجری سنہ کا استعمال عام ہے اور اس تقویم کو سرکاری حیثیت حاصل ہے۔

۵۔ ایک اشکال یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ہجرت نبوی کا تاریخی سفر ۲۷ رصفر سے ۲۲ رربیع الاول تک ہوا ہے۔ ماہ محرم اس میں شامل نہیں، پھر سنہ ہجری کا آغاز ربیع الاول کے بجائے محرم الحرام سے کیوں؟ ہجرت نبوی ﷺ سے تقریباً دو مہینہ پہلے سے سنہ کا آغاز کیوں کیا گیا؟

اس کے جواب میں وہ قول دوہرانا مناسب ہوگا جو حضرت عثمان نے محرم الحرام کو مبدأ مقرر کرنے کا مشورہ دیتے وقت فرمایا تھا: ''محرم الحرام کو سنہ کا پہلا مہینہ مقرر کرو، یہ ماہ حرام ہے، عرب اسے پہلا مہینہ شمار کرتے ہیں اور یہ حج سے واپسی کا زمانہ ہے پس صحابہؓ نے محرم کو پہلا مہینہ قرار دیا۔'' (فتح الباری ج ۷ ص ۲۶۹، ابن عساکر ج اول ص ۳۷)

گویا مہینوں کی بابت قدیم زمانے سے چلے آرہے عربوں کے نظام کو باقی رکھا گیا، یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب خلیفۃ المسلمین کے خطبۂ حج کا پیغام لے کر مسلمان حاجی گھروں کو لوٹ رہے ہوتے ہیں اور یہ پیغام دنیا کے چپہ چپہ تک پہنچ جاتا ہے۔

اس تعلق سے حافظ ابن حجرؒ نے ایک عمدہ بات لکھی ہے ''چونکہ بیعت عقبہ ثانیہ ذوالحجہ ۱۳ رنبوی میں ہوئی اور یہ بیعت ہجرت نبوی کی تمہید تھی اس تمہید کے بعد جو پہلا چاند طلوع ہوا وہ ماہ محرم کا چاند تھا اور اسی مہینہ میں آپ ﷺ نے ہجرت کا ارادہ فرمالیا تھا۔ اسی مناسبت سے صحابہ نے ماہ محرم کو مبدأ کی حیثیت سے برقرار رکھا۔ میرے علم کی حد تک یہی توجیہ بہتر ہے۔'' (فتح الباری جلد ۷ ص ۲۶۸)

ہجری تقویم کے بعض خصائص و امتیازات:

ہجری تقویم میں بعض ایسے خصائص و امتیازات ہیں جو دوسرے سنین اور کلینڈر میں نہیں پائے جاتے ہیں۔

۱۔ سنہ ہجری قمری تقویم ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ماہ و سال کی تعیین کے لیے چاند ہی میقات بن سکتا تھا۔ اس کے برعکس رائج شمسی سال (عیسوی کلینڈر) فطری سال نہیں بلکہ خالص حسابی سال ہے۔ جو علم ہیئت اور علم ریاضی پر مبنی ہے۔ اور تاریخ کے مختلف ادوار میں علم ہیئت کے نظریات میں تبدیلی یا اصلاح کے ساتھ ترمیم و تنسیخ سے دوچار رہا ہے۔ (ملاحظہ کریں: وقت، تعریف، اقسام اور ضروری اصطلاحات از

پروفیسر رفیع اللہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ مجلّہ دراسات دینیہ ۱۹۹۵۔۱۹۹۲(۱۹۹۶) حوالہ تحقیقات اسلامی جولائی تا ستمبر ۱۹۹۹ رویت ہلال اختلاف مطالع اور فلکی حساب)

۲۔ہجری تقویم کی بنیاد رویت ہلال ہے، چاند کے عروج وزوال کے مظاہر ہر ماہ آسمان پر پوری طرح نمایاں ہوتے ہیں۔آسانی کے ساتھ ہر کوئی معلوم کرسکتا ہے کہ مہینہ مکمل ہوگیا ہے، کسی رصدگاہ جانے کی ضرورت نہیں۔اسی طرح قمری ہجری سال ۳۵۴ دن سے کم اور ۳۵۵ دن سے زیادہ کا نہیں ہوتا۔

۳۔اختلاف لیل ونہار اور گردش ارض وقمر سے سال ومہینے کا جو فطری نظام ہے، ہجری سنہ بالکل اس کے مطابق ہے قمری سال حقیقی سال ہوتا ہے۔جب چاند زمین کے گرد ایک چکر مکمل کرلے تو مہینہ اور بارہ چکر مکمل کرلے تو سال پورا ہوتا ہے۔حالانکہ عیسوی سنہ میں ایسا کچھ استقلال نہیں۔عیسوی سنہ سال میں ۳۶۵ دن اور تقریبا چھ گھنٹے ہوتے ہیں گویا آخری دن ربع کے اختتام پر ہی سال مکمل ہوجاتا ہے اور دن کا ۳/۴ حصہ اگلے سال میں شمار کیا جاتا ہے۔اس طرح بلا منزل بیچ دن ہی میں سال کا اختتام ہوجاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ تصحیح کے لیے ہر چوتھے سال فروری ۲۹ دن، لیپ سال، ہر صدی کا آخری سال عدم لیپ اور ہر چار صدی کا آخری سال لیپ شمار کیا جاتا ہے اور ہر چار ہزار سال بعد لیپ کا شمار نہیں ہوتا، اتنی حسابی زحمتوں کے بعد بھی عیسوی سال حقیقی نہیں ہو پاتا۔(جوہر تقویم از ضیاء الدین لاہوری ص ۲)

۴۔سنہ ہجری شروع سے اپنی اصل صورت مجوزہ پر باقی اور قائم چلا آرہا ہے، اس میں ترمیم کی ضرورت نہیں۔اسلامی تقویم کی یہ وہ منفرد خصوصیت ہے جو غالبًا دنیا کے کسی متداول کلینڈر میں نہیں، عیسوی تقویم بھی اس خصوصیت سے عاری ہے۔(رحمۃ للعالمین جلد دوم ص ۴۵۰)

عیسوی تقویم تو بار بار ترمیم ہوچکی ہے آخری ترمیم پوپ گریگوری کے حکم سے ۴/اکتوبر ۱۵۸۲ء کے بعد آنے والے دن کو ۵/ کے بجائے ۱۵/اکتوبر ۱۵۸۲ء شمار کیا گیا تا کہ اس سے پہلے جو ہر سال ۱۱/منٹ ۱۴/سکنڈ کی مقدار اپنے صحیح مقدار سے ہٹ جایا کرتی تھی اس کی تصحیح ہوجائے، کیونکہ فروری ۲۹/کرنے پر بھی صحیح تعین نہیں ہوپاتا ہے۔

اسی طرح عیسوی تقویم کے مبدأ میں اختلاف رہا ہے یکم جنوری کو مبدأ کی حیثیت میں (circum cision style) سرکم سائزن اسٹائل کی رو سے گریگوری تقویم کے اجراء کے وقت مقرر کیا گیا۔اس پر مستزاد یہ کہ عیسوی تقویم کی ترمیم اتفاقی نہیں بلکہ ہر ترمیم کو الگ الگ ملکوں نے مختلف

اوقات میں جاری کیا۔

۵۔ بہ لحاظ تداول اور استعمال بھی سنہ ہجری دنیا کے اکثر مروجہ سنین سے قدیم سنہ ہے گرچہ دوسرے مروجہ سنین اپنے اعداد کے لحاظ سے سنہ ہجری سے زیادہ پرانے معلوم ہوتے ہیں۔(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: رحمۃ للعالمین جلد دوم ۴۵۰ تا ۴۵۱)

عہد فاروقی ۱۷ھ میں اسے سرکاری واسلامی سنہ قرار دیا گیا اور ہر سطح پر اس کا استعمال ہوا۔۷۴۸ء مطابق ۱۳۰ھ میں جب عیسوی سنہ کو رائج کیا گیا تو ہجری سنہ با قاعدہ عوامی و سرکاری سطح پر بڑے پیمانے پر استعمال ہو رہا تھا، مسلمان ہر چھوٹے بڑے معاملات اور خط و کتابت میں اسے استعمال کر رہے تھے۔

واضح رہے عیسوی سنہ ۷۴۸ء مطابق ۱۳۰ھ میں رائج تو کر دیا گیا لیکن غیر معروف رہا۔اس وقت مسلمانوں کی حکمرانی تھی، ہر طرف سنہ ہجری کا رواج تھا۔ ہاں جب مسلمانوں کا سیاسی زوال ہوا، علم وتمدن اور سیاسی اقتدار مسلمانوں سے جاتا رہا، تب دسویں صدی کے اختتام پر وقت کے مسیحی مورخین نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف غلط منسوب کر کے عیسوی سنہ پر زور دیا اور بار بار ترمیم واضافہ کر کے مقبول عام بنانے کی کوشش کی۔(تقویم تاریخی، عبدالقدوس ہاشمی 'سالہائے قبل الہجرۃ و قبل المسیح')۔

۶۔ہجری سنہ میں لوند، کسر یا ماہ کبیسہ نہیں ہوتا، سالوں کا حساب ہمیشہ قمری بنیادوں پر ہوتا ہے۔اور شمسی سال کے لیے تطبیق دینے کے لیے کبیسہ کا کوئی سسٹم نہیں ہے کیونکہ وقت تکوینی نظام کا حصہ ہے اور نسئی کی صورت میں خود انسان کا دخل ہوتا ہے۔

مولانا وحیدالدین خان ایک جگہ نسئی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قرآن مجید میں جس چیز کی ممانعت کی گئی ہے وہ کبیسہ کے مہینے ٹھہرانا نہیں بلکہ نسئی ہے۔ (التوبہ:۳۷) نسئی کے معنی عربی زبان میں تاخیر کے ہیں۔یعنی مؤخر کرنا، ہٹانا، مثلاً حوض پر ایک جانور پانی پی رہا ہے اور آپ نے اس کو ہٹا کر اپنے جانور کو حوض پر کھڑا کر دیا کہ پہلے آپ کا جانور پانی پی لے اس کے بعد دوسرا پیئے، تو اس طرح ہٹانے کو کہیں گے نسأ الدابۃ''۔

حضرت ابراہیمؑ کے ذریعہ جو طریقے رائج ہوئے تھے، ان میں سے ایک یہ تھا کہ سال کے بارہ مہینوں میں سے چار مہینے ''اشہر حرم'' (خاص ادب واحترام والے مہینے) ہیں۔یہ مہینے ذوالقعدۃ، ذوالحجۃ، محرم اور رجب تھے۔ان میں خونریزی اور جدال وقتال بند کر دیا جاتا تھا لوگ حج وعمرہ اور کاروبار کے لیے امن وامان کے ساتھ آزادانہ سفر کر سکتے تھے۔ بعد میں جب قبائل عرب میں سرکشی پیدا ہوئی تو انہوں نے

اس قانون کی پابندی سے بچنے کے لیے نسیؑ کی رسم نکالی، یعنی جب کسی زورآور قبیلہ کی خواہش ماہ محرم میں جنگ کرنے کی ہوئی تو ایک سردار نے اعلان کر دیا کہ امسال ہم نے محرم کو اشہر حرم سے نکال کر اس جگہ صفر کو حرام کر دیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں محرم کو اپنی جگہ سے ہٹا کر صفر کی جگہ رکھ دیا ہے۔ یہی محترم مہینوں کو آگے پیچھے کرنے کی رسم تھی، جس کو نسیؑ کہا جاتا تھا۔ اور اسی کے متعلق قرآن میں کہا گیا ہے کہ ''زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ'' ہے۔ (علم جدید کا چیلنج ص ۳۴)

۷۔ ہجری سنہ کا ایک امتیاز دنوں اور مہینوں کی گردش ہے جو کسی بھی متداول کلینڈر میں نہیں ہے، اسلامی مہینے مختلف موسموں میں گردش کرتے رہتے ہیں، دراصل اسی امتیازی وصف کو باقی رکھنے کے لیے کبیسہ نہیں ہوتا، یہ بظاہر نقص معلوم ہوتا ہے کہ ہجری مہینے موسم کے ساتھ باقی نہیں رہ پاتے۔ حقیقت میں اسلام کی ایک صفت مساوات یہاں کارفرما ہے۔ ۳۰ سال کے قلیل عرصہ میں ایک ہجری مہینہ ہر موسم میں شریک ہو جاتا ہے۔ ارکان اسلام روزہ حج اور زکوۃ قمری مہینوں سے وابستہ ہیں، اگر تقلب ایام کو باقی نہ رکھا جاتا، ماہ کبیسہ کی دراندازی ہوتی تو ہماری یہ عبادتیں ایک ہی موسم کے ساتھ خاص ہو کر رہ جاتیں۔ اسلام دین فطرت ہے، انسان کی فطرت میکانکی یکسانیت کو ناپسند کرتی ہے اور تنوع سے انسان کو تازگی ملتی ہے۔ ''خدانخواستہ اسلامی سال کا شمار شمسی حساب پر ہوتا یا اس میں ماہ کبیسہ کے اختیار کرنے کی برائی دراندازہوتی تو نصف دنیا کے مسلمان ہمیشہ کے لیے آسانی اور نصف دنیا کے مسلمان ہمیشہ کے لیے سختی میں پڑ جاتے کیونکہ ایک عالم جغرافیہ سے یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ دسمبر جو نصف شمالی دنیا کا سرد اور سب سے چھوٹے دن کا مہینہ ہے وہ نصف جنوبی دنیا کا گرم اور طویل دن کا مہینہ ہے۔ پس اسلام کی مساوات و جہانگیری کا اقتضا ہی یہ تھا کہ اسلامی سال قمری حساب پر ہوتا اور قمر کی حرکات کو انسانی اختراع لوند وغیرہ کی شمولیت سے کالعدم نہ کر دیا جاتا۔ وللہ الحجۃ البالغۃ''۔ (رحمۃ للعالمین جلد دوم ص ۴۵۱۔۴۵۲)

۸۔ ہجری سنہ کی ایک خصوصیت عبادتی کوائف میں عالمی مساوات ہے جو دراصل تقلب ایام کا نتیجہ ہے۔ ''قمری میقات کے نتیجہ میں تمام مسلمانان عالم کو عبادت کی ادائیگی کے وقت موسمی کیفیات میں یکساں طور پر شریک ہونے کا موقعہ ملتا ہے۔ عالم انسانیت کا کوئی گروہ اور خطۂ ارض کا کوئی علاقہ اپنی عبادات کے معاملہ میں کسی موسم سے محروم نہیں رہتا، بصورت دیگر ہر جگہ کے لوگ ہمیشہ کسی ایک ہی مخصوص موسم میں عبادت کے پابند ہوتے اور اس کی بنا پر دیگر مسلمانوں کے ساتھ دوسرے موسم میں عبادات کے احساسات میں شریک نہیں ہو پاتے۔ ایک آفاقی و عالم گیر مذہب کے وصف عالمگیریت

کے یہ سراسر خلاف تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی عبادات میں بھی انسانی برادری کے درمیان مساوات وعدل کو قائم رکھا۔‘‘ (رویت ہلال اختلاف مطالع اور فلکی حساب: مفتی صباح الدین ملک فلاحی قاسمی، سہ ماہی مجلّہ تحقیقات اسلامی، جولائی۔ستمبر ۱۹۹۹ء)

۹۔اس طرح حج جو اسلام کا ایک رکن ہے اور انتہائی اہم عبادت ہے۔ایک مقدس مقام میں بیت الحرام کی زیارت کے لیے بڑی تعداد میں دنیا بھر کے حاجی حضرات جمع ہوتے ہیں، حج کے مناسک اور فرائض کی ادائیگی کرتے ہیں اور اللہ کی کبریائی کا اجتماعی اعلان کرتے ہیں، تقلب ایام کی صورت میں اس مقدس مقام پر ذکر الٰہی، عبادات، حج کے مناسک اور اس کے ارکان کی ادائیگی ہر موسم سردی، گرمی، برسات میں ہوتی رہتی ہے اور تمام موسمی زمانے میں اس مقدس عبادت میں شریک ہوتے ہیں۔

۱۰۔ڈاکٹر حمید اللہؒ نے ’’عہد نبوی میں نظام مالیہ وتقویم‘‘ عنوان کے تحت اپنے خطبہ کے دوران ایک دلچسپ نکتہ بیان کیا کہ تجارت اور معدنیات وغیرہ کے ٹیکس پر قمری سال کو نافذ کرنے کی وجہ سے حکومت کو غیر معمولی فائدہ ہوتا ہے۔ اگر اس مصلحت کا علم آج کے وزرائے مالیات کو ہو جائے تو وہ قمری سنہ کو اختیار کرلیں گے۔ کیونکہ قمری سال شمسی سال سے گیارہ دن چھوٹا ہوتا ہے۔لہٰذا حکومت کو ہر شمسی تیس سال میں ایک زائد سال کے ٹیکس وصول ہوں گے اور کون وزیر اس زائد آمدنی کو پسند نہ کرے گا؟

ایک اور نقطۂ نظر سے جانچیں آج کل حکومت کا خزانہ سال کے آخر میں ٹیکس ادا ہونے سے عین پہلے خالی ہو جاتا ہے، وزارت کو فوری ضرورتوں کے تحت سود پر قرض لینا پڑتا ہے ہجری سنہ کے استعمال کی صورت میں گیارہ دن قبل ٹیکس وصول ہوں گے۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں زراعتی ٹیکس اپنے موسم میں اور تجارتی ٹیکس مختلف موقعوں سے وصول ہوا کرے گا، اس صورت میں خزانہ میں بحران کا امکان کم سے کم ہوگا۔ (خطبات بھاول پور ص ۳۳۹)

۱۱۔آخری بات یہ کہ اس تقویم میں ہجرت کی مناسبت سے امت مسلمہ کے لیے بڑی عبرتیں ہیں۔ ہجرت سراپا پیغام ہے، راہ حق میں استقامت کا، دعوت حق کے لیے سب کچھ قربان کردینے کا، دین کے معاملہ میں کسی بھی درجہ میں مداہنت نہ اختیار کرنے کا، اسلام کی خاطر جان ومال گھر بار عزیز واقارب سب کچھ نچھاور کردینے کا اور ’’ انی ذاهب الی ربی سیهدین‘‘ کا مثالی نمونہ پیش کرنے کا، ہجرت میں یہ بات بھی پوشیدہ ہے کہ باطل چاہے جتنا طاقتور ہو جائے نور حق کو بجھا نہیں جاسکتا اور حق پرستوں کی جماعت بظاہر تنگدستی، مجبوری اور مغلوبیت کی انتہا کو پہنچ جائے لیکن اللہ کی رحمت سے محروم نہیں ہوسکتی

اور اللہ کی مشیت ہوتو غلبہ وتمکن سے اس جماعت کو دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ہجری سنہ کے استعمال کی صورت میں ہر نئے سال کے موقع سے یہ سبق تازہ ہوتا رہتا ہے۔

اس کے برعکس دیگر کلینڈروں کے استعمال میں بعض قباحتیں بھی ہیں۔عیسوی سنہ کے مہینوں اور دنوں کے مأخذ پرغور کریں تو شرک کی بوآتی ہے۔دنوں کی بابت یہ تحقیق ملتی ہے کہ ہفت روزہ تنجیمی مدت کامأخذ مصر ہے، یونان زدہ مصر کے مروج نظریہ کے مطابق زحل، مشتری، مریخ،شمس، زہرہ، عطارد اور قمر ترتیب وار ایک ساعت مفروضہ حکومت کرتے ہیں۔(مفتاح التقویم فقرہ نمبر ۴۸)

غرض دنوں کی مدت تنجیمی یعنی سیاروی مدت ہے اوران کے باطل عقیدہ کے مطابق ہر سیارہ ایک مفروضہ مدت تک خدا ہوتا ہے۔ان ہی خداؤں (دیوتاؤں) سے نسبت دے کر دنوں کا نام رکھا گیا ہے۔آج فلاں دیوتا کا دن ہے saturday کی اصل saturn (سیارہ زحل) ہے، sunday کی اصل sun (سیارہ شمس) ہے، monday کی اصل moon (سیارہ قمر) ہے، وغیرہ۔

اسی طرح ہندی انگریزی مہینوں (چیت بیساکھ جنوری فروری) کی نسبت بھی دیوتاؤں کی طرف ہے۔ ہندوؤں کی بعض مذہبی کتابوں میں یہ عقیدہ مذکور ہے کہ ہرمہینہ کا الگ الگ دیوتا ہوتا ہے، ان دیوتاؤں کے ناموں یا صفت سے وہ اپنا ہرمہینہ منسوب کرتے ہیں۔(**کتاب ابی ریحان البیرونی فی تحقیق ماللھند ص ۱۷۱۔۱۷۶**)

پس ہمیں چاہیے کہ ہجری سنہ کو عام کریں، اس سے متعلق شکوک وشبہات کا ازالہ کریں، اس کے خصائص وامتیازات سے لوگوں کو آگاہ کریں، اس سے متعلق مسائل کی تفہیم کرائیں، ممکنہ حد تک اس کا استعمال کریں اور دوسروں کو بھی تلقین کرتے رہیں۔آج کے علماء اور قائدین ملت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے روز مرہ کے کاموں میں ہجری سنہ کے استعمال کا اہتمام کریں اور عامۃ المسلمین کو بھی برابر اس کی طرف متوجہ کرتے رہیں۔ یہ بات خوش آئند ہے کہ برصغیر ہند میں عام طور پر مدارس عربیہ میں ہجری سنہ کا استعمال کیا جاتا ہے۔اوران کا مالی اور تعلیمی پورا نظام اس کے مطابق چلتا ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمانوں کے دیگر اداروں اوران کی دینی ومذہبی تنظیموں میں بھی اس کا استعمال اسی طرح عام ہو اور اس سلسلہ میں اگر کچھ دشواریاں سامنے آئیں تو ان کو حل کرتے ہوئے سنہ ہجری کے استعمال کی برکت سے وہ اپنے کو محروم نہ رہنے دیں۔جیسا کہ اس سے پہلے اس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔**وما علینا الا البلاغ**

یونیفارم سول کوڈ

ملک کے ثقافتی تنوع کا خاتمہ یا شریعت اسلامی میں مداخلت

جوھر جاوید گیاوی، موبائیل نمبر: 08409640946

ھندوستان ایک کثیر المذ ہب، کثیر اللسان اور کثیر الثقافت ملک ہے۔ تنوع ہی اس ملک کی خوبصورتی ہے جو اسے دنیا کے دیگر تمام ممالک کے بیچ ایک امتیازی اہمیت اور جداگانہ حیثیت عطا کرتا ہے۔ مختلف علاقے، مختلف زبانیں، مختلف تہذیب وثقافت، مختلف رنگ روپ اور مختلف مذاہب کے ماننے والے اس ملک میں صدیوں سے آپس میں اتحاد واتفاق کے ساتھ رہتے آئے ہیں۔ ہمارا ملک دنیا کے سامنے unity in diversity (انیکتا میں ایکتا) کا خوبصورت منظر پیش کرتا رہا ہے۔ اس کی مثال اس خوبصورت گلدستہ کی سی ہے جس میں مختلف رنگ وبو کے حسین وجمیل پھولوں کو رکھ دیا گیا ہو، جس کی کی خوشبو اور خوبصورتی لوگوں کو اپنی طرف مائل کر رہی ہو۔ اسی عظیم تہذیبی ورثہ کو ہمارے ادیبوں نے ادب کے ذریعے، سیاسی رہنماؤں نے سیاست کے ذریعے، صحافیوں نے صحافت کے ذریعے اور شعراء نے شاعری کے ذریعے اپنی آئندہ نسلوں کے حوالے کیا۔ داغ دہلوی کا شعر ہے ؎

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینت چمن
ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

مگر ملک کی یہ گنگا جمنا تہذیب نفرت کے سوداگروں کو اچھی نہیں لگتی کیونکہ اگر یہاں کے لوگ آپس میں شیر وشکر ہو کر رہیں گے تو فسطائی طاقتوں کی سیاسی دکانیں بند ہو جائیں گی۔ اس لیے وہ ملک میں یونیفارم سول کوڈ کے شوشے چھوڑتی رہتی ہے، ان کا ایجنڈا یہ ہے کہ ہندوستان کو ایک ہندو راشٹر میں تبدیل کر دیا جائے، اور یہاں بسنے والے مسلمانوں کے ملی تشخص کو ختم کر دیا جائے۔

یکساں سول کوڈ کا تصور:

یکساں سول کوڈ کا تصور ہندوستان کی آزادی کے پہلے سے چلا آ رہا ہے۔ انگریزی حکومت سے

بھی اسے نافذ کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا، بعد میں جب ملک آزاد ہوا تو ہندوستان کے آئین میں یونیفارم سول کوڈ سے متعلق ایک دفعہ اس میں شامل کر دی گئی۔ یہ دفعہ جو یونیفارم سول کوڈ سے متعلق ہے وہ دستور ہند کے رہنما خطوط کے ذیل میں شامل کی گئی ہے۔ رہنما خطوط کی دفعہ 44 کو دستور ہند کے چوتھے حصے میں شامل کیا گیا ہے۔ اس حصے کی حیثیت اسٹیٹ پالیسی کے لیے رہنما اصول سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں۔ ماہرین قانون کی نظر میں جب انسان کے بنیادی حقوق اور رہنما اصول میں تعارض ہو تو ترجیح شہریوں کے بنیادی حقوق کو دی جاتی ہے۔ رہنما اصول کی دفعہ 44 اور شہریوں کے بنیادی حقوق کی دفعہ 25 میں صریح تعارض پایا جاتا ہے، قانون کی رو سے ایسے میں دفعہ 25 عملاً نافذ العمل ہوگی اور دفعہ 44 قابلِ حذف۔

یونیفارم سول کوڈ کی وکالت کی وجہ:

ملک کے تمام شہریوں کے لیے ایک ہی سول کوڈ کے نفاذ کی وکالت کرنے والوں کی سب سے مضبوط دلیل یہ ہے کہ اس سے قومیت کے تصور کو مضبوطی ملے گی اور قومیت کا یہ تصور ملک کی ترقی کے لیے معاون ثابت ہوگا۔ مگر تاریخ عالم کا مطالعہ اس بات کی نفی کرتا ہے۔ انسانی تاریخ کی بڑی اور ہولناک جنگیں دو ایسے فریق کے مابین لڑی گئیں جن میں فریقین کا سول کوڈ ایک تھا۔ دونوں عظیم عالمی جنگیں اس کی واضح مثالیں ہیں۔ کورو اور پانڈو دونوں کا سول کوڈ بھی ایک ہی تھا مگر دونوں کے درمیان جو جنگ ہوئی اس کی تفصیلات مہابھارت میں موجود ہیں۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سول کوڈ کا یکساں ہونا مضبوط قومی تصور کا ضامن نہیں ہے، بلکہ تاریخ عالم تو اس سے پیدا ہونے والی ہولناک دشمنی کی جانب اشارہ کر رہی ہے۔

مسلم پرسنل لا کا مأخذ:

مسلم پرسنل لا کا مأخذ قرآن وسنت کی تعلیمات کا وہ حصہ ہے جسے ہم اسلام کے عائلی قوانین بھی کہتے ہیں۔ اس وجہ سے مسلم پرسنل لا کا معاملہ راست طور پر مسلمانوں کے ایمان وعقیدہ کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ جس میں ترمیم یا تبدیلی تو دور اس پر کامل قلبی اطمینان کا نہ ہونا ہی کفر کی سرحدوں میں داخل کر دیتا ہے۔ ایک مسلم فرد جس کا اللہ اور اس کے رسول پر ایمان ہے وہ ان قوانین کو قطعی اور اٹل سمجھتا ہے، اور اس کا یہ سمجھنا لازمی اور ایمان کا جزو بھی ہے۔

مسلم پرسنل لا کے یہ قوانین قرآن وسنت کے تمام احکام کی طرح ہمیشہ کے لیے واجب التسلیم واطاعت ہیں، جس طرح مسلمانوں سے نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے کا مطالبہ ہے، بعینہ اسی طرح ان شخصی

قوانین پر بھی عمل پیرا ہونے کا مطالبہ ہے، اس سے بے عملی کا نتیجہ قرآن وسنت کے قوانین کو ترک کرنے پر منتج ہوگا۔ اس بات کا سمجھنا بہت ضروری ہے کہ اسلامی شریعت کے یہ قوانین جن کا تعلق شخصی وخاندانی زندگی سے ہے وہ کوئی عام نوعیت کے قوانین نہیں ہیں جن پر عمل پیرا ہونا اور نہ ہونا نتیجے کے اعتبار سے یکساں ہو، بلکہ ان کی حیثیت قطعی دینی احکام کی ہے اور اسے مسلمانوں کی زندگی سے کسی صورت بھی علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ دین اسلام میں ان قوانین کی حیثیت بھی وہی ہے جو نماز وروزے کی ہے۔

یکساں سول کوڈ اور اس کے ممکنہ خطرات:

یکساں سول کوڈ جس کے نفاذ کی پرزور وکالت کی جارہی ہے وہ یقیناً غیر اسلامی ہی ہوگا۔ ایسی صورت میں اسلام کا عائلی نظام غیر متحرک ہو کر رہ جائے گا اور مسلمانوں کی عائلی وخاندانی زندگی کی عمارت زمین بوس ہو کر رہ جائے گی۔ یکساں سول کوڈ کا نفاذ قطعی طور پر اس بات پر منتج ہوگا کہ مسلمانان ہند اپنی عائلی زندگی کے بہت سارے معاملات میں حکومت کی طرف سے مجبور کیے جائیں کہ وہ حلال چیزوں کو ترک کر حرام چیزوں کا ارتکاب کریں یا کم از کم قرآن وسنت کی ہدایت کو چھوڑ کر غیر اسلامی احکام پر عمل پیرا ہوں۔ یہ خدا کی بنائی ہوئی شریعت میں راست مداخلت ہے، یہی وہ وجہ ہے جس کی بنا پر مسلمانان ہند یکساں سول کوڈ کی اس شدومد کے ساتھ مخالفت کررہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

یکساں سول کوڈ کے نفاذ کا صاف لفظوں میں یہی مطلب ہوگا کہ مسلمانان ہند کا جو جداگانہ ملی تشخص ہے وہ پامال ہو کر رہ جائے۔ انڈین پینل کوڈ کے بعد یکساں سول کوڈ مسلمانوں کے اس آخری حصار کو بھی مسمار کردے گا جس کی بنیاد پر ان کا اپنا ملی تشخص قائم ہے اور یہی وہ مقصد ہے جس کے حصول کے لیے یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی وکالت کی جارہی ہے۔ ملک کی فسطائی طاقتیں ہندوستان کو یک رنگ (ہندوراشٹر) بنادینا چاہتی ہیں۔ مسلمانوں کا جداگانہ تشخص ان کے گلے کی ہڈی بنا ہوا ہے۔

بیداری کی صورتیں:

مسلم معاشرے میں پرسنل لا کے سلسلے میں بیداری لانے کے حوالے سے چند باتوں پر توجہ مرکوز کرنا ضروری ہے۔ ان میں سب سے پہلا قدم یہ ہے کہ ہم برادران وطن کے سامنے بھی اور مسلمانوں کے درمیان بھی اسلام کا مکمل تعارف کرائیں۔ یہ فرض منصبی سے انتہائی غفلت کا ہی نتیجہ ہے کہ وہ آخری حصار جسے ہم مسلم پرسنل لا کہتے ہیں وہ بھی خطرے میں پڑ گیا ہے۔ امت وسط ہونے کے ناطے ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اپنے ملک میں اسلام کا مکمل تعارف پیش کریں۔

دوسری بات جس کی جانب توجہ کرنی چاہیے وہ مدافعانہ روش سے احتراز ہے۔اسلام دین فطرت ورحمت ہے۔سارے انسانوں کے لیے ہے۔اللہ تعالی کا کوئی بھی حکم نہ تو نعوذ باللہ بے جا ہے اور نہ ہی اس پر کہنگی کا الزام عائد کیا سکتا ہے۔وہ اس ذات کا بنایا ہوا قانون ہے جو حکیم بھی ہے اور دانا بھی۔جو انسانی نفسیات کا بھی گہرا علم رکھتا ہے اور جس کے سامنے ماضی، حال اور مستقبل سب یکساں ہیں۔لہٰذا اس کا ہر حکم قابل عمل اور اپنے اندر بے پناہ خیر وبرکت اور رحمت سموئے ہوئے ہے۔

قرآن مجید کا ہر حکم خواہ وہ تعدد ازدواج کے قبیل سے ہو یا طلاق ثلاثہ اور وراثت کے قبیل سے، اسے پورے اعتماد کے ساتھ بے کم وکاست جرأت مندی کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت ہے، اور اس میں پوشیدہ حکمتوں اور مصلحتوں کو بے نقاب کرنے کی ضرورت ہے تاکہ برادران وطن پر بھی اور مسلم معاشرے پر بھی اس کا سرتا سر معقول اور مبنی بر انصاف ہونا ظاہر ہو جائے۔

عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ ہماری صفوں میں سے کچھ لوگ طلاق کے واقعات اور تعدد ازواج کے سلسلے میں دیگر اقوام کے ساتھ تناسب اور شرح کے چکر میں پڑ جاتے ہیں۔تناسب اور شرح بیان کرنا کوئی علمی جواب نہیں ہے۔تعدد ازواج کی مصلحتوں اور حکمتوں کو جب واضح انداز میں بیان کیا جائے گا تو اس میں پوشیدہ خیر سے کوئی بھی عاقل وفرزانہ انکار نہیں کر سکتا ہے۔کیا یہ جواب معقول سمجھا جائے گا کہ مسلمان ایک سے زائد نکاح اس لیے کرتے ہیں کہ ہندو بھی ایسا کرتے ہیں بلکہ ان کی شرح تعدد ازواج کے سلسلے میں مسلمانوں سے زیادہ ہے؟ مدافعانہ روش سے باہر نکل کر اعتماد وجرأت کے ساتھ احکامات اسلامی کی تشریح وتفہیم ہی اس مسئلے کا حل ہو سکتا ہے۔

تیسری ضرورت یہ ہے کہ بعض دینی حلقوں نے خواتین کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔خواتین کی ذہن سازی اور تعلیم وتربیت کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔دینی امور میں انھیں بھی شانہ بہ شانہ رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ ان پر بھی یہ واضح رہے کہ شریعت اسلامیہ میں ہمارے حقوق متعین ہیں اور صرف اسلام ہی ان کے حقوق کی ضمانت دیتا ہے۔وہ دل وجان سے شریعت اور اس کے احکام سے راضی ہوں اور خواتین کے درمیان اسلام کی صحیح ترجمانی کرنے کے قابل بن سکیں۔انھیں اسلامی احکام کے مطابق اپنے عائلی معاملات فیصل کرانے کی طرف متوجہ کیا جائے۔ظاہر ہے کہ وہ غیر اسلامی نظام سے اپنے حقوق طلب کریں گی تو یہ کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے۔

...... امتیازات ......
کے چند امتیازی پہلو

سعید اختر اعظمی ،ریاض۔سعودی عرب

تنقیدی مضامین ادبی رسائل وجرائد کی زینت بنتے رہتے ہیں جن کو قارئین کا ایک محدود طبقہ زیر مطالعہ رکھتا ہے۔ایسے میں ظاہر ہے یہ ہر خاص وعام تک رسائی حاصل نہیں کر پاتے جب تک کہ یہ کتابی صورت میں نہ ڈھل جائیں۔یہی وجہ ہے کہ ہر محقق ومصنف کی اولین کوشش ہوتی ہے کہ وہ جوں ہی چند مضامین کا خالق بن جائے اسے فوراً کتاب کی صورت میں پیش کر کے صاحب کتاب بن جائے۔احمد امتیاز کے تنقیدی مضامین بھی وقفہ وقفہ سے ادبی جریدوں کے صفحات پہ رونق بکھیرتے رہے ہیں۔انھوں نے پہلا تنقیدی مجموعہ بارہ برس قبل 'ادبی محاکمے' کے نام سے پیش کیا تھا۔یہ دوسرا حوالہ 'امتیازات' کے عنوان سے گزشتہ دنوں قارئین کے روبرو ہوا ہے جو اُن کے نام اور انفرادی انداز نقد کو بھی عیاں کرتا ہے۔

'امتیازات' احمد امتیاز کے 22 مضامین کی یکجائی ہے جس میں شاعر وافسانہ نگار اور ڈرامہ نگاروں کے فکر وفن کے مخصوص پہلوؤں پر گفتگو ہے۔'سودا کے قصائد میں طنز کی صورت' میں بتایا گیا ہے کہ طنز زندگی کی حماقتوں کے خلاف ایک قسم کا ردعمل ہے جس کا مقصد اصلاح معاشرہ اور تنقید حیات ہے۔ روایت سے انحراف کو شعار بنانے والے سودا میر کے ہم عصر تھے جن کے یہاں اقدار کی پامالی اور تہذیب کی پلٹتی ہوئی بساط طنز واستہزا کے طور پر سامنے آتی ہے۔ انھوں نے بمقابلۂ غزل قصائد میں سماجی بصیرت کا اظہار کیا۔اپنے پُر آشوب عہد کا بے باکانہ تجزیہ اور شعری تناظر میں وسعت انہی کا وصف خاص ہے۔تمام شعبہ ہائے حیات کے انحطاط پر سودا طنز کے سوا بھلا کیا کر سکتے تھے۔ نبی آخر الزماں اور ائمہ کی شان میں 14 قصائد نیز سلاطین ووزراء پر لکھے گئے 25 قصیدے طنز سے عاری ہیں۔البتہ وہ قصائد جن میں حالات کی تصویر کشی کی گئی ہے طنز کا بھرپور عنصر کارفرما ہے۔اپنی نازک مزاجی کے سبب وہ عمر بھر

معاصرین سے برسرپیکار رہے۔ان کا ہجویات لکھنے کا مقصد مذہبی اختلافات،اخلاقی کمزوری اور معاصرانہ چشمک ہے۔

'مصحفی کے شعری امتیازات' غلام ہمدانی مصحفی کے اسلوب تک رسائی کی کوشش ہے۔انھوں نے دہلی کے بنیادی اسلوب میں لکھنؤ کے خارجی عناصر کو شامل کر کے نئے اسلوب کی بنیاد ڈالی۔وہ انشاء وجرأت کے رنگ سے کوسوں دور رہے۔ان کا کلام تصنع وتکلف سے پاک ہے۔لفظیات اور لہجہ آفرینی میں انھوں نے نئے تجربے کیے۔ان کے یہاں محبوب کی تمثال گری میں پیکر کے تفاعل کا ہنرمندانہ استعمال سامنے آتا ہے۔'اقبال کے متصوفانہ فکر پر ایک نظر' ان کی دو تصانیف 'ایران میں فلسفہ الہیات کا ارتقاء' اور 'الہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید' کے علاوہ بعض مکتوبات کے حوالے سے سیر حاصل جائزہ ہے۔ایران میں صوفیانہ شاعری کے عروج وزوال کے پانچ سو برس بعد اقبال نے ہندوستان میں اسے حیات نو عطا کی۔فلسفہ تصوف نے انھیں ابتدا ہی سے متوجہ کیا۔انھوں نے تصوف کی فلسفیانہ تشریح کے شانہ بہ شانہ باضابطہ نظریہ بھی قائم کیا۔وہ تحریک تصوف کی مفصل تاریخ قلمبند کرنے کے خواہاں تھے مگر زندگی نے مہلت ہی نہ دی۔انھوں نے روایتی صوفیانہ تحریک پر ضرب لگائی اور خانقاہی تصوف کے تصور کو تبدیل کیا۔اقبالیات شناسوں نے ان کے کشف اور مرحلہ شوق کے دعوے کی تائید کی ہے۔

'تاباں کی غزل گوئی' لطافت ونفاست کا آئینہ خانہ ہے۔وہ بنیادی طور پر رومانی شاعر تھے۔ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے سبب خیالات میں تبدیلی آئی اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ غزلیں لکھنے لگے۔ان کی بعض غزلوں میں مومن وحسرت اور اختر شیرانی کا رنگ ملتا ہے۔'پروین شیر کا شعری سیاق' انسانی دکھ درد کی داستان سے عبارت ہے۔ان کا شعری جمالیات 'کرچیاں' اور نہال دل پہ سحاب جیتے' سے نمایاں ہوتا ہے۔شاعری اور مصوری کی یکجائی ان کے تجربوں کا آہنگ ہے۔مروجہ رسم کے خلاف احتجاج اور انسان وفطرت کے درمیان رابطہ کی بنیاد رکھنا ان کا فرض اولین رہا ہے۔

'خواتین کی شاعری' میں سے بیشتر کے یہاں مرد مخالف فکر کا فروغ ملتا ہے۔جبر واستحصال ان کا خاص موضوع ہے۔البتہ ان میں سے بعض نے مہندی لگے ہاتھوں کی حدود کو پھلانگ کر ہتھیلیوں کے زخموں کو کریدتے ہوئے سچائی تلاش کرنے کی جرأت بھی کی ہے۔'روایتی شاعری کی عصری معنویت' شعری تجربات کا عکاس ہے۔ہر شاعر نے روایت سے رشتہ مستحکم رکھا ہے کیونکہ یہ ایک عظیم سرمایہ ہے۔عصری معنویت سے ہم آہنگی کے لیے لازمی ہے کہ روایت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔

'محمد حسین آزاد اور سیر ایران پر ایک نظر' ان کی بصیرت و مشاہدہ کا اظہار ہے۔ 23 دسمبر 1885 تا 24 جولائی 1886 وہ ایران کے مختلف شہروں کے دورے پر رہے جسے انھوں نے بے ترتیب اور غیر مربوط انداز میں لکھا۔ یہ سفر نامہ دیگر سفر ناموں سے یکسر مختلف ہے۔ اس میں ایرانی شہروں کی تفصیلات نہیں بلکہ ذات کا عمل حاوی ہے۔

'مولانا آزاد کے تعلیمی خیالات' جہالت دور کرنے کے لیے تیار کی گئی تعلیمی پالیسی کے حوالے سے ہیں۔ اس میں انھیں بھلے ہی خاطر خواہ کامیابی نہ ملی ہو لیکن اتنا ضرور ہوا ہے کہ ہمارا ملک سائنسی تعلیم میں آج بھی سب سے آگے ہے۔

'خورشید الاسلام کا جہان نقد' دراصل تخلیقی سطح کو چھو لینے والی تنقید ہے۔ ان میں تنقیدی تقاضے ناپید ہیں البتہ نثری اسلوب قابل تعریف ہے۔ 'امراؤ جان' اور 'گئو دان' پر لکھے گئے نوٹ میں انھوں نے نئے زاویے تلاش کیے ہیں۔ یوں ان کی تنقید بعض کمزوریوں کے باوجود نئی آگاہیوں سے متعارف کرواتی ہے۔

'مشتاق احمد یوسفی کا فن' ان کی پانچ تصانیف 'چراغ تلے'، 'خاکم بدہن'، 'زرگزشت'، 'آب گم'، 'شام شعر یاراں' کے رنگارنگ اسلوب سے عیاں ہے۔ وہ صورت واقعہ کی تعمیر میں خود کے ساتھ قاری کو بھی تماشائی بنا لیتے ہیں۔

'عبدالقوی دسنوی اور بھوپال' شخصیت اور شہر میں رشتہ تلاش کر کے مطالعہ کی نئی جہت کا تعین ہے۔ دسنوی کو یہ اولیت حاصل ہے کہ انھوں نے دہلی اور بھوپال سے اقبال کے تعلقات کی نشاندہی کی۔ 'عصمت کی شخصیت فہمی' ان کے گیارہ خاکوں 'دوزخی'، 'اسرار الحق مجاز'، 'عشق مجازی اور وہ'، 'میرا دوست میرا دشمن'، 'خواجہ احمد عباس'، 'کانٹوں بھری وادیاں'، 'کچھ میری یادیں'، 'چراغ روشن ہے'، 'خوابوں کا شہزادہ'، 'میں تمھیں نہیں جانتی' کے حوالے سے ہے جو بالترتیب مرزا عظیم بیگ چغتائی، مجاز، منٹو، خواجہ احمد عباس، جاں نثار اختر، پطرس بخاری، کرشن چندر، سجاد ظہیر اور مہندر ناتھ پر لکھے گئے۔ 'خواجہ احمد فاروقی کا اسلوب تحریر' رشتوں کی پہچان، اخلاق زندگی اور تہذیبی روایت کو نمایاں کرتا ہے۔ دہلی کے تیئیسویں خواجہ کے اعزاز سے سرفراز خواجہ احمد فاروقی کے یہاں لفظی تکرار ضرور ملتی ہے جس سے عبارت کا حسن مجروح ہوا ہے۔ 'مٹی کے حرم: بقائے زندگی کا استعارہ' ساجدہ زیدی کے دوسرے ناول کا جائزہ ہے۔ پہلے ناول 'موج ہوا پیچاں' میں ناول اور شاعری کے تخلیقی عمل کو یکجا برتنے کا تجربہ ناکام ثابت ہوا۔ 'مٹی کے حرم' میں بھی یہ تجربہ ہے مگر یہ سابقہ ناول کی خامیوں سے مبرا ہے۔

''غضنفر کی ناول نگاری' ان کے ناولوں 'پانی'، 'کینچلی'، 'کہانی انکل'، 'مم'، 'دویہ بانی'، 'فسوں'، 'وش منتھن' اور 'شوراب' کے حوالے سے ہے۔ تجربات، موضوع کی جدت اور اسلوب کی رنگارنگی کے ساتھ ان کے یہاں زندگی کا عمل اور ردعمل بھی ہے جو قاری کو اپنے سحر سے نکلنے نہیں دیتا۔ 'سنگریزے ہوائیں اور حاشیائی کردار 1857 کے حوالے سے لکھے گئے رشید انجم کے ڈرامہ پر گفتگو ہے۔ 98 مناظر پہ مشتمل اس ڈرامہ کے فرضی کردار بھی چست مکالمے کے سبب زندگی کی اوجھل حقیقتوں کو نمایاں رکھتے ہیں۔

'کمال احمد کی ڈرامہ نگاری' ان کے فن کی بھرپور صلاحیتوں کا اظہاریہ ہے۔ انھوں نے اپنے ڈراموں میں فیصلہ اور حکم لگانے کے بجائے سب کچھ قاری پر چھوڑ دیا ہے۔

'عہد حالی میں نظم کا تصور اور اس کا فروغ'، بعض خامیوں کے باوجود کامیاب رہا ہے۔ ان کے زمانہ میں ہر اُس تخلیق کو نظم سے موسوم کیا گیا جو موضوع وحدت سے متصف تھی۔ اسی کوشش کے سبب نظم کی اصطلاح کو رواج ملا۔ 'مخاطبہ در باب تانیثیت' میں یہ بتلایا گیا ہے کہ مغرب میں 200 برس سے تانیثی تحریک جاری ہے جو حقوق نسواں دلانے میں ناکام رہی ہے۔ اسے کامرانی سے ہم کنار کرنے کے لیے مل جل کر مسئلہ کا حل تلاش کرنا ہوگا۔ 'افسانوی مجموعوں کی دستیابی کا مسئلہ' دراصل اشاعتی اداروں کی عدم توجہی کے سبب ہے۔ اسے بازار اور لائبریری تک پہنچانا ان کی ذمہ داری ہے ورنہ گم شدہ قاری کی تلاش ممکن نہ رہے گی۔ 'اردو میں ترجمہ کی روایت' لاطینی سے عربی میں منتقلی سے شروع ہوئی۔ اہل عرب نے 'ترجمہ' کی اختراع کی جو عصر حاضر میں بھی دوسروں سے استفادہ کی اہم صورت ہے۔

ترجمہ کرتے وقت یہ لازمی ہے کہ اصل متن کے لیے کوئی متبادل لفظ نہ ملے تو اسے جوں کا توں لکھ دیا جائے، ہر جگہ لفظی ترجمہ سے گریز کیا جائے۔ مثلاً برگ گل کا ترجمہ 'پھول کی پنکھڑی' ہوگا جبکہ اقبال نے اسے 'پھول کی پتّی' لکھا ہے۔ ماہرین کے مطابق 'کسی بھی زبان میں ترجمہ خواہ کیسا ہی ہو اصل عبارت کی اثر پذیری اور حسن کو ہرگز نہیں پہنچ سکتا'۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ پہلے نظم میں ترجمہ ہوا یا نثر میں البتہ اتنا طے ہے کہ ابتدائی ترجمہ عربی اور فارسی سے ہوا۔ فورٹ ولیم کالج، دلی کالج، سرسید تحریک اور انجمن پنجاب نے اسے استحکام بخشا۔ 1930 سے دوسری زبانوں سے ترجموں کا آغاز ہوا۔ اس کے لیے جس سمت و رفتار کی ضرورت ہے اردو کا دامن اب بھی اس سے خالی ہے۔

احمد امتیاز کے یہ مضامین متنوع موضوعات کی کہکشاں ہیں اور اس حوالے سے سیر حاصل معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ان کی تحقیق کی درازیٔ عمر کی دعا بجا طور پر کی جاسکتی ہے۔ ●●●

غزل سے غزل نامہ تک

سید راشد حامدی فلاحی

غـــزل کسے کہتے ہیں اور اس کا مالہ وماعلیہ کیا ہے؟ میں نہیں جانتا۔ اس کا صحیح جواب تو وہ ناقدین ہی دے سکتے ہیں جو غزل کو روایت، ترقی پسندی جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے خانوں میں بانٹتے ہیں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ جب کسی خاص فریکوئنسی پر دل کا ساز بج اٹھتا ہے تو غزل ہوتی ہے، جب کسی کے تغافل سے زخمِ دل لَو دے اٹھتے ہیں تو غزل ہوتی ہے، جب کلی انگڑائی لے کر پھول بننے پر آمادہ نظر آتی ہے تو غزل ہوتی ہے، جب تارِ نفس مضراب غم کو آواز دیتا ہے تو غزل ہوتی ہے، ہجر وفراق کے لمحات جب تنہائیوں سے شرابِ نشاط وانبساط کشید کرنے لگتے ہیں تو غزل ہوتی ہے، جب غم عقبی غم دنیا میں اور غم جاناں غم دوراں میں ڈھل جاتا ہے اور دل کی دھڑکنیں نبض کائنات سے ہم آہنگ ہونے لگتی ہیں تو غزل ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ خواجہ آتش کے نزدیک شاعری محض لفظی صنعت گری اور مرصع سازی کا نام ہو مگر غزل صرف لفظوں کا حسن ترتیب ہے نہ چاول کے دانے پر قل ھواللہ احد رقم کرنے کی ترکیب بلکہ وہ تہذیبِ جذبات واحساسات بھی ہے اور تہذیبِ غمِ کائنات بھی۔

یہ مت کہو کہ لفظ وبیاں کا یہ کھیل ہے
محبوب کی بھی جادوبیانی غزل میں ہے
دیکھو تو حرف و لفظ کی صنعت گری ہے بس
سوچو تو ایک گنج معانی غزل میں ہے

ڈاکٹر تابش مہدی کے یہ اشعار محض اشعار نہیں ہیں، بلکہ ان میں ایک جہانِ معانی آباد ہے، جس کی یافت کے لیے غزل کی روایت، غزل کی تاریخ اور غزل کے تدریجی ارتقائی مراحل کا علم لابدی ہے۔

غزل نامہ یوں تو بہ یک نظر غزلوں کا ایک مجموعہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ محض غزلوں کا مجموعہ نہیں، غزل کی منظوم تنقید بھی ہے اور منظوم تاریخ بھی۔ اس میں غزل کا حسن تجسیم بھی ہے اور اس کی روایات کی تفہیم بھی۔ یہ غزل کا واقعاتی منظر نامہ بھی ہے اور اس کا ہمہ جہتی آئینہ خانہ بھی۔ جس میں غزل کو

ہرزاویے سے اس کی تمام جزئیات کے ساتھ دیکھا اور پرکھا جاسکتا ہے۔ یہ غزل کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والوں کے خلاف جہاد بھی ہے اور غزل کے وسیع تر تناظر میں اجتہاد بھی۔ اس میں انفراد بھی ہے اور نقد و انتقاد بھی۔ غزل کی ماہیت، اس کی فکری معنویت اور غزل میں عہد بہ عہد ہونے والی ارتقائی تبدیلیوں کے مابین ارتباط بھی ہے اور غایت درجے کی فکری ونظری احتیاط بھی، جس میں اختلاف رائے کی گنجائش تو نکالی جاسکتی ہے، مگر اسے اجتہاد بالرائے کہہ کر مکمل طور پر نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ تابش مہدی نے جو کچھ کہا ہے واقعاتی شواہد اور تاریخی دلائل کی روشنی میں کہا ہے۔

اپنی بے بضاعتی کا اعتراف کرتے ہوئے مجھے یہ کہنے میں قطعاً باک نہیں کہ غزل نامہ ڈاکٹر تابش مہدی کا ایک ایسا منفرد تخلیقی تجربہ ہے، جس کی کوئی نظیر میرے علم کی حد تک ہمارے سرمایہ غزل میں موجود نہیں ہے۔ کچھ عرصہ قبل عبدالمنان طرزی کا مجموعہ کلام آہنگ غزل منظر عام پر آیا تھا۔ مگر اس کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ آہنگ غزل خود آہنگ غزل سے محروم ہے۔ طرزی صاحب نے آہنگ غزل میں جو پیرایہ بیان اختیار کیا ہے وہ پیرایہ نظم ہے، پیرایہ غزل نہیں۔ تابش مہدی کا یہ شعر اس پر صادق آتا ہے:

منثور ہے کبھی، کبھی منظوم ہے غزل
کس درجہ میرے عہد میں مظلوم ہے غزل

تابش مہدی کے غزل نامہ کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ یہ غزل کی منظوم تاریخ وتنقید ہوتے ہوئے بھی صوری اور معنوی دونوں ہی اعتبار سے آہنگ غزل ہے۔ جہاں دو چار گام پر ہی لوگوں کے سانس پھول جاتے ہیں، وہاں انہوں نے تن تنہا صدیوں کا طویل سفر کامیابی کے ساتھ طے کیا ہے۔ انہوں نے اپنی منزل کا تعین بھی خود کیا اور اس کے لیے راستے بھی خود ہی نکالے۔ سنگلاخ چٹانیں کاٹ کر راستے بنانے کا ہنر انہیں بہ خوبی آتا ہے۔

تابش مہدی نے غزل نامہ میں جو خلاقانہ تجربہ کیا ہے، وہ اس لحاظ سے بھی استعجابی کیفیت کا حامل ہے کہ اس کی از اوّل تا آخر تمام غزلیں غزل ردیف میں ہیں، جس نے اس کی اہمیت کو کافی وقیع اور اس کے ادبی افق کو مزید وسیع کر دیا ہے۔ اب سے تقریباً تین دہائی قبل علامہ انور صابری نے ساقی نامہ میں ساقی کی ردیف میں اسی قسم کا تجربہ کیا تھا۔ مگر غزل نامہ بالکل جداگانہ اہمیت کا حامل ہے۔ نوعی اور موضوعی دونوں ہی اعتبار سے ان دونوں کے درمیان کوئی مماثلت نہیں ہے۔ کیونکہ غزل نامہ میں غزل ردیف میں عمومی غزلیں نہیں بلکہ وہ ہمیں ایک ایسے نگار خانہ غزل کی سیر کراتا ہے جو صدیوں پر محیط ہے۔ بہ الفاظ دیگر غزل نامہ حرمت غزل بھی ہے اور عظمت غزل بھی، عرفان غزل بھی ہے اور ایقان غزل بھی۔ غزل کی

فطری معصومیت اور پاکیزگی کا پیکر بھی ہے اور تابش مہدی کے فنی شعور و پختگی کا مظہر بھی۔ اس میں غزل کے معیارات بھی ہیں اور اس کے فنی کمالات بھی تاکہ اس کے اصل خال وخط کی تحدید کے ساتھ اس کے مذہبی و اخلاقی اقدار کی تجدید بھی ہو سکے۔ میرے خیال میں غزل نامہ تابش مہدی کا ایسا کارنامہ ہے، جس کا موازنہ حالی کے مقدمہ شعر وشاعری سے تو نہیں کیا جا سکتا تاہم اس کا میزانیہ اس سے کم بھی نہیں ہے۔ مقدمہ شعر وشاعری اگر نثر میں نقش اول کی حیثیت رکھتا ہے تو تابش مہدی کا غزل نامہ غزل کی تاریخ میں نقش اول ہے۔

غزل نامہ کی دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی تمام غزلوں میں ایک مخصوص روحانی فضا جلوہ گر ہے۔ یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان میں حمد ونعت کا سا مذہبی تقدس ہے۔ مذہبی تیقنات کی دل پذیر روشنی ہے۔ اخلاقی تحدیدات کی پاکیزگی ہے اور اخلاقی استعارات اور تاریخی تلمیحات کے جلو میں عصری شعور آ گہی ہے۔ اس چیز نے غزل نامہ کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس کی شعری جمالیات کا پس منظر سراسر مذہبی اور اخلاقی ہے۔

غزل نامہ میں تابش مہدی نے غزل کی اقدار و روایات کی تفہیم کی جو کوشش کی ہے اس کے لیے ان کی جتنی بھی ستائش کی جائے کم ہے:

سوز غم حیات ہماری غزل میں ہے
اک روح کائنات ہماری غزل میں ہے
حسن جمالیات ہماری غزل میں ہے
نور تجلیات ہماری غزل میں ہے

یہاں یہ بات صراحت کی طالب نہیں کہ تابش مہدی کی غزل کا مرکزی موضوع عشق ہے معاشقہ نہیں۔ ان کے یہاں عشق کے قلبی واردات تو ہیں مگر ہوس اور معاشقے کی معاملہ بندی کہیں نظر نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں جنسی تجربے روحانی تجربوں کی بنیاد نہیں ہیں۔ سوال پیدا ہوگا کہ کیا ان کا عشق ناپختہ اور سودائے جنوں خام ہے؟ نہیں بلکہ ان کا عشق عشق الٰہی سے مستنیر اور ان کی جمالیات نور تجلیات سے مستعار ہے۔ اسی لیے وہ مملکت غزل کو بھی صحیح معنی میں اسلامی مملکت کی طرح پاکیزہ اور خیر و برکت کی فضا سے معمور دیکھنے کے خواہاں ہیں، ان کے اس جذبے کو ہم دعائے خلیل بھی کہہ سکتے ہیں اور ان کے پاکیزہ فکر ونظر کی دلیل بھی۔

یہی وجہ ہے کہ جب معاصر غزل ان کے پاکیزہ شعری وجدان سے ٹکراتی ہے تو وہ بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں:

تیری تاریخ سے جس کو نسبت نہیں
وہ سخن دراداکار ہے اے غزل
جس پہ تیری روایت نہیں منکشف
وہ نہ شاعر نہ فن کار ہے اے غزل

تابش مہدی نے یہاں غزل گوئی کے لیے غزل کی تاریخ اوراس کی روایت سے واقفیت کولازمی قرار دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہاں غزل کی روایت اوراس کے تاریخی پس منظر کی تفہیم کے لیے ان اسباب کی تعیم بھی ضروری ہے جس کی بناپر غزل ترقی پسندی اور جدیدیت جیسے خودساختہ ادبی نظریات کی آنکھوں میں سدا سے خار بن کر کھٹکتی رہی ہے اوراب مابعد جدیدیت ایک نئے قالب میں آستینوں میں خنجر چھپائے غزل کو سینے سے لگانے کے لیے بیتاب ہے۔

غزل عربی کا لفظ ہے، لیکن ادبی اعتبار سے یہ فارسی سے مستعار ہے اوراس کی پشت پر جوتہذیبی، ثقافتی اوراخلاقی قدریں ہیں وہ اسلامی افکارونظریات اور ہندوستان کی مسلم مغلیہ تہذیب اوراس کی ثقافتی اقدار پر مبنی ہیں۔ وسط ایشیا سے ہجرت کر کے آنے والی نسلوں اورقوموں کی طرح غزل کو ہندوستان اور ہندوستان کی مسلم مغلیہ تہذیب اس قدر بھائی کہ اس نے فارسی سے پورے طور پر اپنا دامن چھڑالیا۔ فارسی شعروادب میں غزل آج مفقودالخبر اورقصہ پارینہ بن چکی ہے۔ جبکہ اردو میں یہ سب سے مؤثر، توانااور مستحکم صنفِ سخن کے طور پر جانی جاتی ہے۔

غزل کے اسی تاریخی وتہذیبی پس منظر کی بناپر اخلاق باختہ کمیونزم کے علم برداروں نے اسے تہ تیغ کرنے کی اپنی سی ہرممکن کوشش کی، لیکن صدیوں کی مسافت نے اسے اتنا سخت جان اوراس کی بنیادوں کو اتنا مضبوط کردیا تھا کہ وہ نظم کوغزل کا بدل ثابت کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ پاسداران غزل نے ہرمحاذ پرڈٹ کران کا مقابلہ کیا۔ انہوں نے غزل کی روایتی ساخت اوراس کی فنی وشعری ماہیت کی ہی نہیں اس کی لفظیات، جمالیات اوراس کی رمزیت واشاریت کی بھی خلوص دل کے ساتھ حفاظت کی۔ یہی نہیں، بلکہ انہوں نے نہایت خاموشی کے ساتھ عصری شعوروآگہی کے صالح عناصر کوبھی غزل کے پیرایہ اظہار سے ہم آہنگ کر کے دکھایا۔ لیکن غزل کے جذب وانجذاب اور ردوقبول کا اپنا ایک معیار ہے، جس کے تحت وہ ہر دور کے فکروفلسفہ کے لیے اپنے استعارے خلق کرتی ہے اور ہر دور کے سماجی و معاشرتی تقاضوں کے تناظر میں لفظیات وجمالیات کے اپنے خلقیے خود تراشتی ہے۔ درج ذیل اشعار غزل کی اسی وسعت نظری کا ثبوت ہیں:

فکر ونظر کا گوہر تاباں غزل میں ہے
حقا کہ اک حیات درخشاں غزل میں ہے
معشوق بے وفا کی بھی شامل ہیں شوخیاں
حالات کا بھی سوز فراواں غزل میں ہے
باقی اگر ہیں فکر کہن کی تجلیاں
تہذیب عصر نو بھی تو رقصاں غزل میں ہے
بقراط و جالینوس بھی موجود ہیں یہاں
روح جنید و شبلی وحساں غزل میں ہے
ہیں میر و مصحفی بھی ابھی جلوہ گر یہاں
اقبال کی بھی فکر نمایاں غزل میں ہے
اکبر کا طنز، حضرت شہباز کا مزاح
سب کچھ بقدر ظرف نمایاں غزل میں ہے
میں ہی نہیں ہوں حسن غزل پر فریفتہ
ماحول خانقاہ بھی رقصاں غزل میں ہے

یہ محض اشعار نہیں ہیں بلکہ غزل کے تاریخی ادوار کا محاکمہ بھی ہیں۔ان سے ہر دور میں غزل کے اندر ہونے والی تبدیلیوں کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔مگر اس کا یہ عمل کوئی انوکھا اور اچھوتا نہیں ہے، تابش مہدی فرماتے ہیں:

تیرے اک اک شعر میں ہے فلسفہ
تیرا لہجہ کائناتی ہے غزل

....

اس میں ہے زندگی کا ہر اک فلسفہ
اور سنجیدہ دانش وری ہے غزل

غزل کا یہ کائناتی لہجہ اور اس کا آفاقی کردار ہی اسے دانش وری کی سند عطا کرتا ہے۔

غزل اپنی بے پناہ قوت اور لچک کے سبب ہی آج تک زندہ، متحرک اور توانا ہے۔اس کی مقبولیت کا راز بھی یہی ہے کہ اس میں ہر دور کے فکر وفلسفہ کے صالح عناصر کو اپنے اندر جذب کر لینے کی صلاحیت

پائی جاتی ہے۔ آپ کسی بھی دور کی غزل کو اٹھا کر دیکھئے، پرکھئے اور غور کیجئے آپ محسوس کریں گے کہ یہ اپنے سے ماقبل کی کاربن کاپی یا زیروکس نہیں ہے۔ بلکہ ہر دور کے امتیازات کا عکس غزل میں موجود ہے، جسے کچھ لوگ تغیرات سے تعبیر کرتے ہیں۔لیکن یہ غزل کے نہیں زمانے کے تغیرات ہیں جن کا عکس غزل کے اپنے رنگ وآہنگ میں پایا جاتا ہے۔ غزل نے ہر دور میں ادب کو بے شمار سیاسی، سماجی اور تہذیبی وثقافتی استعارے عطا کیے ہیں۔ظلم، جبر اور استحصال کے خلاف احتجاج اور بغاوت کے لاتعداد مؤثر پیرایۂ اظہار تخلیق کیے ہیں، دبے کچلے بے زبانوں کو زبان بخشی ہے اور انہیں اشاروں اور کنایوں میں گفتگو کا سلیقہ سکھایا ہے۔اس بات کو غزل کے دشمن بھی تسلیم کرتے ہیں:

اسے دشمن بھی اس کے مانتے ہیں
جدا شیریں بیانی ہے غزل کی
غزل سے بدگمانی توبہ توبہ
روایت غیر فانی ہے غزل کی

یہ غزل کی روایت غیر فانی کا ہی اعجاز ہے کہ اس نے ترقی پسندی کی اشتہاریت، جدیدیت کی عریانیت و بے سروپائیت اور مابعد جدیدیت کی پراسراریت کو اپنے قریب بھی نہیں آنے دیا۔ ہر فکر اور فلسفے کی طرح غزل کے کچھ امتیازی اوصاف ہیں جن میں حیا، پاکیزگی اور اخلاقی اقدار قابل ذکر ہیں۔ ان کے تانے بانے مذہب اور روحانیت سے تشکیل پاتے ہیں۔رمزیت، اشاریت، اختصار، ایجاز، تہہ داری اور لفظیات میں جمالیات اس کی غیر فانی روایات ہیں۔انہی سے غزل کی شناخت اور پہچان ہوتی ہے۔اسے ختم کرنے اور کچھ دوسری شناختیں قائم کرنے کے لیے جی توڑ کوششیں کی گئیں مگر غزل تو دور غزل کی گرد کو بھی کوئی نہ پاسکا۔سب اپنی موت آپ مر گئے۔غزل آج بھی میر ومومن، داغ وغالب، ذوق ومصحفی، حسرت وفانی، شفیق وجگر، ماہر وعامر اور حفیظ وطاہر کے حوالے سے جانی جاتی ہے۔غزل کے یہی حوالے غزل نامہ کے توسط سے تابش مہدی کو بھی مطلوب ہیں۔

میں نے پڑھا ہے میر کو مومن کو داغ کو
ہاں نازش غزل تھے یہی نازش غزل
حسرت شفیق اور نشور و جگر کو بھی
کہتا ہے آج سارا جہاں دانش غزل

یہ محض حوالے نہیں، غزل کے بنیادی ستون ہیں، جن کی قرأت ادبی تناظر میں نفل نہیں فرض کا درجہ

رکھتی ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر غزل کا بے روح خاکہ تو بنایا جا سکتا ہے مگر اس میں روح نہیں پھونکی جا سکتی۔ موزونیٔ طبع اور لفظوں کے الٹ پھیر سے بے روح غزل کی تشکیل و تجسیم تو ہوسکتی ہے مگر کچھ نہ کہہ کر بہت کچھ کہہ جانے کا ہنر اور کچھ کہہ کر کچھ اور سمجھانے کا فن سرمایۂ غزل کی قرأت کے بغیر ناممکن ہے۔ اس لیے کہ غزل کچھ لفظوں سے کہتی ہے اور کچھ سے زیادہ بلکہ بہت کچھ لفظوں کی تہہ داری سے بیان کرتی ہے۔ غزل کی معنیاتی سطح جو بظاہر خاموش اور سادہ نظر آتی ہے مگر اس کے اندرون میں پیچ در پیچ کچھ دوسری زیریں لہریں بھی پوشیدہ ہوتی ہے، جن تک رسائی کے لیے اوپری سطح سے اندرونی سطح تک غوطہ زنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ تب گوہر مقصود ہاتھ آتا ہے۔ جبکہ آج کا المیہ یہ ہے کہ متن کی قرأت کو ہی غیر ضروری تصور کیا جا رہا ہے۔ ایسی صورت میں بین المتونیت کا فہم کہاں سے آئے گا اور غزل میں رمزیت، اشاریت اور تہہ داری کہاں سے آئے گی۔ جس کا نتیجہ غیر معیاری اور سطحی غزلوں کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔

اب گفتگو کہاں ہے غزل کی زبان میں
ہونے لگی ہے اب تو عجب شاعری غزل

ایک دوسری غزل میں تابش مہدی اپنے کرب کا اظہار اس انداز میں کرتے ہیں:

اب غزل کی آڑ میں باتیں عجب ہونے لگیں
ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی ہے معیاری غزل

یہ سطحیت اور غیر معیاریت دراصل سہل پسندی کی دین ہے، جس کے لیے ڈاکٹر تابش مہدی جدیدیت کو ذمے دار ٹھہراتے ہیں۔ وہ صاف اور دوٹوک الفاظ میں کہتے ہیں:

ایسا جدیدیوں نے غزل کو کیا تباہ
عنقا سی ہوگئی ہے اب آرائش غزل

پاسداران غزل کے ہاتھوں شکست کے بعد ترقی پسندی اور جدیدیت کا ناجائز اختلاط قائم ہوا اور جدیدیت کے بطن سے مابعد جدیدیت کی تولید ہوئی، جس کی سیرت بھی وہی ہے اور صورت بھی وہی۔ شراب بھی وہی ہے اور تلخی بھی وہی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اب اسے شربت روح افزا کی بوتل میں پیک کر کے بازار ادب میں فروخت کیا جا رہا ہے۔ ہمارے عہد کے نام ور ناقد و دانش ور پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ایک جگہ لکھا ہے:

''شاعری ہر چند کہ نہ فلسفہ ہے نہ مذہب، لیکن شاعری کا گہرا تعلق فلسفے سے بھی ہے اور مذہب سے بھی۔ بڑے فن کار کی پہچان یہ ہے کہ اگر اس کے جہانِ شعر کا تعلق کسی عقیدے سے ہے تو وہ اس کی

حدود کو ایسی وسعت اور بالیدگی عطا کرتا ہے کہ عقیدہ مذہبی تحدید سے ماورا ہوکر آفاقیت اور انسانیت کی آواز بن جاتا ہے اور زمان و مکان سے ماورا ہوکر اس وسیع تر دردمندی میں داخل ہو جاتا ہے، جو میراث آدم ہے۔ یوں ایک مذہبی نشان یا موٹف یکسر سیکولر ہو جاتا ہے۔ اس پر بعض لوگوں کو اعتراض ہو سکتا ہے لیکن مذہب کو غیر مذہبی بنانا ادب کا کمال ہے۔'' (جدیدیت کے بعد، ص ۲۲۸)

یہاں میں بہ صد احترام اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ محترم نارنگ صاحب یہاں ایسے لوگوں کی فہرست بھی دے دیتے تو اچھا ہوتا جنہوں نے مذہب کو غیر مذہبی بنانے کا ادبی کمال دکھایا ہے۔ بابائے غزل میر نے تو اپنی غزل کی تفہیم کے لیے جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں کو شرط قرار دیا ہے۔ جامع مسجد کی سیڑھیاں دراصل ہند اسلامی تہذیب و ثقافت کا استعارہ ہے، جسے اس وقت ایک مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ مگر میر وولی ہی نہیں غالب و داغ سے لے کر تابش مہدی تک ہر دور کی شاعری بالخصوص غزل کو سمجھنے کے لیے اسلامی اصول و مبادیات اور ہندوستان کی مسلم تہذیب و ثقافت کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ یہ فکری جبر نہیں لسانی ضرورت ہے۔

غزل دل کی تحریک سے تخلیق ہوتی ہے، جو غزل کی روایت کا جزو لاینفک ہے:

ذہن میں ردِعمل ہوتو غزل ہوتی ہے
کوئی موقع ہو محل ہو تو غزل ہوتی ہے
صرف الفاظ کی ترتیب سے کیا ہوتا ہے
دل کی جانب سے پہل ہوتو غزل ہوتی ہے

مزاج شناس غزل بخوبی جانتے ہیں کہ غزل ندرت خیال، لطافت بیان اور نزاکت ہنر سے عبارت ہے۔ اسے اشتہاریت اور عریانیت سے کوئی سروکار نہیں۔ غزل تشکیل سے زیادہ تاثیر اور ترسیل کی طالب ہے۔ اسی لیے غزل کو کسی ٹکسالی اور لگے بندھے ضابطہ پر نہیں پرکھا جا سکتا اور نہ اس کے لیے ایسے پیمانے ڈھالے جا سکتے ہیں، جن میں غیر ملکی درآمد شدہ افکار و نظریات کی شراب کشید کر کے پیش کی جا سکے۔ فیض کی مقبولیت غزل کی کم پروپیگنڈا مشنری کی زیادہ مرہون منت ہے۔ جس طرح آئی پی ایل کا ہر کرکٹ کھلاڑی مختلف کمپنیوں کا مجسم اشتہار ہوتا ہے، اسی طرح آج شعرا، ادبا، اور ناقدین بھی مختلف نظریاتی جماعتوں کا اشتہار نظر آ رہے ہیں خاص طور سے وہ شعرا اور ادبا جو بوجوہ اکیڈمک پس منظر رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں شعری و ادبی کمال کم، پروپیگنڈا زیادہ ہوتا ہے۔ فطری نظریاتی وابستگی کے مقابلے میں جبری نظریاتی جکڑبندی انہیں شعر و سخن کے وسیع تر آفاق میں نئے سیاروں کی تلاش کے لیے مہمیز نہیں

کرتی بلکہ کولہو کا بیل بناتی ہے، جو دن بھر ایک ہی ڈھرے پر چکر کاٹتا رہتا ہے۔اس سے پوچھو کہ کتنا چلے جواب دے گا دس کوس۔مگر اس سے پوچھو کہ پہنچے کہاں تو وہ کیا جواب دے گا؟ کیونکہ دن بھر چلنے کے بعد بھی وہ شام کو وہیں کھڑا نظر آتا ہے جہاں وہ صبح کھڑا تھا۔

ڈاکٹر تابش مہدی نے غزل نامہ میں غزل کو اس کے وسیع تر مذہبی، اخلاقی اور تہذیبی تناظر میں دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے اور غزل کے مزاج اور اس کی شناخت پر ہونے والے ہر استحصالی حملے کا دندان شکن جواب دیا ہے۔اس کی زد میں وہ ناقدین بھی آئے ہیں جنہوں نے غزل کے مذہبی و اخلاقی اور تہذیبی و ثقافتی منظر نامے کی وجہ سے اسے ادب بدر اور زندہ درگور کرنے اور اسے نیم وحشی ورجعت پسند اور روایت پسند کہہ کر مطعون کرنے کی کوشش کی ہے۔

وحشی کوئی کہے ہے تو کوئی روایتی
خاموش سنتی رہتی ہے معصوم ہے غزل

ایک دوسرے مقام پر وہ یوں رقم طراز ہیں:

نیم وحشی کہنے والے خود ہیں وحشت کا شکار
آبرو ہے شاعری کی صنف ہے پیاری غزل

مجھے یہاں تابش مہدی کی اس رائے سے صدفی صد اتفاق ہے کہ غزل کو نیم وحشی صنف سخن کہنے والے خود وحشت کا شکار ہیں۔کیونکہ صنف غزل پر کلیم الدین احمد کی یہ تنقید وحشیانہ عمل کے دائرے میں آتی ہے۔میں یہ بات قطعیت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ تنقید نہیں غزل کے مذہبی و اخلاقی اقدار اور اس کی الوہی جمالیات پر کھلا وحشیانہ حملہ ہے۔کیونکہ نیم وحشی یا وحشی کا لفظ جیسے ہی نظر سے گزرتا ہے یا پردۂ سماعت سے ٹکراتا ہے معاً ذہن کی اسکرین پر جنگلوں اور غاروں میں زندگی گزارنے والے وحشی قبائل کی بے معنی اچھل کود اور ان کے وحشیانہ طرز بود و باش کا منظر نمودار ہو جاتا ہے۔جبکہ غزل کا لفظ تہذیبی عظمت وشوکت، پاکیزگی فکر و خیال اور تمدنی جلوہ آرائیوں کا نگار خانہ اپنے جلو میں لے کر آتا ہے۔میری اس رائے کی تصدیق رشید احمد صدیقی کے اس خیال سے بھی ہوتی ہے کہ ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہوئی ہے۔تابش مہدی نے غزل کی اس تہذیب کو اس کی اصل بنیادوں پر استوار، مستحکم اور توانا کرنے کی مجددانہ کوشش کی ہے۔یقین ہے کہ غزل نامہ غزل کو نئی حرارت، نئی قوت اور نئی توانائی عطا کرنے میں ایک مؤثر کردار ادا کرے گا۔یہ میری پیش گوئی نہیں، میرا ایقان ہے۔

صدائے دل

معزز ڈاکٹر اور بے چارہ کسان!

ماسٹر شاہ عالم فلاحی،
استاذ شعبہ اعلیٰ جامعۃ الفلاح

ایک گاؤں تھا۔ دور بہت دور ایک ندی کے کنارے۔ اس سے متصل اک انتہائی خوبصورت زمین تھی جہاں اس زرخیز زمین کا آخری حصہ ختم ہوتا تھا، اس کے دونوں جانب پورب تا پچھّم دلکش پہاڑی سلسلہ تھا۔ پہاڑی سے نیچے زمین کچھ دور تک نشیب وفراز والی تھی۔ اس کے انتہا پر تا حد نگاہ پھیلی ایسی زرخیز زمین تھی جو ندی سے ایسے ملتی تھی جیسے ندی کا پانی اور شاداب زمین ایک دوسرے کو محبت کا بوسہ دے رہے ہوں۔ گاؤں ندی کے اس مقام پر آباد تھا جہاں پہاڑی کا آخری سرا ندی کے پاس آ کر اپنے وجود کو ختم کر دیتا تھا۔ یعنی فطرت کی یہ خوبصورت اور دل کش تخلیق اپنا وجود ندی کے بے حد صاف وشفاف پانی میں مدغم کر کے وہ لذت وفرحت محسوس کر رہی تھی جس کو دل کی نظر ہی محسوس کر سکتی تھی اور دیکھ سکتی تھی۔ فطرت کے ایسے بہت سے پوشیدہ حسن ہیں جن تک رسائی کے لیے آنکھ نہیں ایک زندہ دل کی ضرورت ہوتی ہے: لا تعمی الابصار بل تعمی القلوب التی فی الصدور۔ (القرآن)

اس گاؤں میں چند گھر تھے جن میں مختلف برادریاں امن وآشتی اور محبت واپنائیت کی بھاؤناؤں میں رہتی تھیں۔ کوئی مندر کی مورت کا بھکت تھا تو کوئی مسجد میں جا کر اپنے رب حقیقی کے سامنے اپنے دل کا دکھڑا سناتا تھا۔ یہ مسجد کیا تھی مٹی کا ایک گھروندا تھی۔ اوپر سے گھاس اور پتیوں سے بانس کی پھیلی شہتیر کو چھپا دیا گیا تھا۔ وضوگاہ انتہائی سادہ تھی۔ مٹی کے لوٹے تھے۔ گاؤں کے تمام ہی لوگ اعلیٰ ڈگریوں کی چمک دمک سے دور تھے۔ گاؤں میں ایک اسکول تھا جس میں زبان کا علم کسی حد تک بچوں کو دیا جاتا تھا۔ اور اخلاقی اقدار اور باہمی معاشرت پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ باہم ایک دوسرے کے ساتھ محبت وایثار کے ساتھ مل کر رہنے کا چلن سکھایا جاتا تھا۔ اس گاؤں کے لوگ انتہائی سادہ تھے یعنی مزاج میں عیاری اور مکاری نہیں تھی، بغض وعناد سے کوسوں دور تھے۔ نفرت اور چغل خوری کو ان کی سرحد کو چھونے کی بھی

اجازت نہیں تھی۔ان کے دل آئینے کی طرح صاف تھے۔اس لیے اگر کبھی کسی سے کوئی غلطی ہوتی تو دوسرے کے آئینہ وجود میں اپنی خامی فوراً دیکھ لیتا اور شرمندہ ہوکر درست کرلیتا۔ کتنے ہی پیارے اور صاف ستھرے وجود آج صرف اور صرف اس وجہ سے گناہ میں لت پت ہیں اور نکلنے کا راستہ ہی نہیں پاتے، کہ اپنے اردگرد موجود تعلیم یافتہ اور مہذب خاندانوں کے نوجوانوں اور دوشیزاؤں کے پرفریب وخیرہ کن نخروں کی دجل وفریب والی لالی کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔

وہ اندھیرے ہی بھلے تھے کہ قدم راہ پہ تھے
روشنی لائی ہے منزل سے بہت دور ہمیں

اس گاؤں کے آخری سرے پر ایک ایسا گھر تھا جو مٹی کے کھپرے کا بنا تھا۔اور گاؤں سے تھوڑا ہٹ کر ایک کھیت میں موجود تھا۔گھر کے سامنے چند کمرے تھے۔ایک کمرے میں کسان اپنے کھیتی کے ساز و سامان رکھتا تھا، دوسرے کمرے میں غلہ رکھنے کی بہت سی ٹھیکی بنی ہوئی تھیں۔ٹھیکی میں غلہ رکھنے سے اکثر غلہ گھن کیڑوں سے محفوظ رہتا تھا۔اور گھر میں موجود چوہوں کو بلامحنت کے خوراک مل جاتی تھی۔وہ اپنا پیٹ بھرتے اور کسان کی حفاظت اور صحت وترقی کی دعا کرتے تھے۔ جب انسان اپنے وجود کو پوری طرح سے خدا کی خوشنودی میں گم کردیتا ہے تو اس کی ہرادا پیاری بن جاتی ہے اور پھر بادسموم کے جھونکے، پہاڑوں کی خوفناک بلندیاں،صحراؤں کی ڈراؤنی وسعتیں، درندوں کی سفاکیوں اور تہذیب نو کے پروردہ نوجوانوں اور دوشیزاؤں کی عیاریوں اوران کی مکاریوں سے بڑی آسانی سے محفوظ رہتا ہے۔

فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے
وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

کسان کے کئی ایک بچے تھے۔جن میں چند آنگن کے پھول تھے تو دوسرے باپ کا سہارا تھے۔ کسانی میں بیٹوں اور بھائیوں کی کتنی اہمیت ہوتی ہے اس کو صرف وہ سمجھ سکتا ہے جو اس پیشہ سے جڑا ہو،گھر کے سامنے چند ٹڈیاں تھیں۔جن میں اس کے جانور رہتے تھے۔بیل تھے، گائیں تھیں۔ چند بکریاں،تو کچھ دیسی مرغیاں۔ایک دو کالے اور لال مرغ۔یہ مرغ تو اکثر شرارت ہی میں مشغول رہتے تھے۔یہ تو اپنی فطرت میں پورے نیتا تھے جن کو انتشار پھیلانے میں مزہ آتا ہے۔

یہ کسان گندم کثرت سے پیدا کرتا تھا۔موٹی روٹی اور پرئی اور لوڑھیاں کی بنی چٹنی اور پھر گڑ کا بنا شربت، ان کا محبوب ناشتہ ہوا کرتا تھا۔کبھی کبھی گائے کے دودھ سے بنی دہی کی ملونی ہوتی، جس میں

غذائیت بھی ہوتی اور روح افزا سے زیادہ لذت بھی۔ اکثر وہ چنے اور شربت پر گزارا کر لیتے۔ گڑ کے شربت میں کتنا آئیرن ہوتا ہے اس کو صرف کوئی حکیم ہی یا پھر وہ کسان سمجھتا تھا۔ یہ صرف پیٹ کو ٹھنڈا کر کے معدے کی خشکی ہی نہیں زائل کرتا ہے بلکہ اس کے استعمال سے چہرہ پر فطری نکھار آتا ہے اور پھر یہ نیند کا نقیب بھی بنتا ہے۔ منڈی جہاں اس کے بچوں کو برسات سے محفوظ رکھتی وہیں اس کی چھت پر کدو اور کریلے کی بیلیں بھی پھیلتیں اور اپنا پھل دیا کرتی تھیں، اس کے گھر میں فرج نہیں تھی، اور ضرورت ہی کہاں تھی۔ انسان نے فطرت سے بغاوت کر کے صرف گناہ ہی نہیں کیا ہے بلکہ اپنے جیون کو جہنم بنالیا ہے۔

جینے کو تو ایک تبسم، ایک نظر ہی کافی تھی
جانے لیکن ہم ہی کیوں، محروم انعام ہوئے

ویسے کسان اور اس کے بچے و بیوی کبھی بیمار نہیں پڑتے تھے۔ فطرت کے جلوے اور دیہات کا سہانا منظر تو خود دل و دماغ کے لیے ایک خوبصورت مرہم ہیں۔ دوسرے ان کے افکار مثبت تھے۔ بیماریوں کا زیادہ تر شاخسانہ حسد، کینہ، نفرت و عداوت، بے ایمانی، حرص و لالچ ہوتے ہیں۔ اگر انسان ان سے بچنے کا گر سیکھ لے تو بہت سے گھاتک امراض سے محفوظ رہے گا اور اعلی سند یافتہ لٹیرے اپنے خوشنما بنگلے میں بیٹھے مریضوں کے انتظار میں ٹکر ٹکر دیکھیں گے۔

پر موت شدنی ہے اور غم اور خوشی ہی انسان کا اصل خمیر ہے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ اس کا سب سے بڑا بیٹا جو انتہائی لاڈلا تھا اور اطاعت کا پیکر مجسم، بخار کی ایسی حالت میں پھنس گیا، جس سے نکل ہی نہیں پارہا تھا۔ اس نے بڑی کوشش کی۔ اپنے گرد موجود جڑی بوٹیوں سے علاج کرتا رہا پر مرض بڑھتا رہا۔ وہ انتہائی نحیف ہو گیا اور بستر پر چلا گیا۔ اس کا ایک دوست کبھی کبھی شہر جاتا تھا۔ اس نے اس کو ایک بڑے شہر کے کھتونے سے اعلی ڈگری لے کر آنے والے ڈاکٹر کا پتہ بتایا۔ دنیا نے جب سے ڈگریاں دینا شروع کر دی ہیں کتنے ہی غریب پر ذہین بچوں اور بچیوں کی صلاحیتوں کو کچل دیا ہے۔

علم نے وہ گل کھلائے ہیں
ہر طرف ظلمتوں کے سائے ہیں

مرتا کیا نہ کرتا۔ وہ اپنے بچے کو لے کر آٹو کی مدد سے شہر پہنچا۔ بڑی محنت سے ڈاکٹر کا لُوٹ گھر پایا۔ انٹرنس سے داخل ہوا۔ دوسرے مریضوں کی مدد سے ڈاکٹر سے قریب ہونا چاہا تو روک دیا گیا۔ اس کو بتایا

گیا کہ ابھی تمہارا نمبر نہیں آیا ہے۔ پہلے پانچ سو روپے فیس جمع کر کے نمبر لو۔ وہ جھگڑ پڑا، اور بولا۔تم لوگوں کی انسانیت کیا ہوئی، میرا بچہ بری حالت میں ہے، میں ابھی ملنا چاہتا ہوں۔ ورنہ میرا لخت جگر مر جائے گا۔ باہر بیٹھی سسٹر نے کہا: بلا نمبر کے دکھانے کے لیے ایک ہزار فیس ہے، مرتا کیا نہ کرتا، جیب سے ایک چھوٹے اور گندے رومال میں لپٹے روپے نکال کر سسٹر کو گننے کو کہا۔ یہ روپے ایسے مڑے تھے جیسے بنیے کا رجسٹر۔ ڈاکٹر سے ملا۔

بہر حال مجبوری سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہے ایک ہزار فیس کے، ایک ہزار دوا کے جو مشکل سے چار یوم کی تھی۔ پاخانہ اور پیشاب ٹیسٹ کے تین سو روپے دے کر اور دوا لے کر شام کے وقت شہر کی پرفریب رونق سے نکل کر اپنے گاؤں کی ڈگر پر چل پڑا۔غم سے نڈھال تھا۔لب پر دعا تھی۔ سوچ میں گم تھا۔ اے خدا دوبارہ روپیہ کہاں سے لاؤں گا۔ اے خدا کوئی راستہ نکال دے، کہ اس مہذب ڈاکٹر کا درشن نہ ہو، جب انسان ہر سہارے سے کٹ کر خدائے ارض وسماء کی طرف رخ کر لیتا ہے تو خدا ایسے غیرت مند بندے کی غیرت کو ننگا نہیں ہونے دیتا۔ بہر حال اس کا بچہ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو گیا۔ اور کسان ماضی کی طرح ستم گریوں کو بھول کر پھر اپنے روزمرہ کے مشاغل میں گم ہو گیا۔ ایک دن جبکہ گاؤں کا مدرسہ بند تھا۔ گیہوں کی فصلیں پورے جوبن پر تھیں۔ ارہر میں پھول ایسے شرمیلے تھے جیسے کوئی گاؤں میں پلی شرمیلی اور باحیا دوشیزہ، تو دوسری طرف ندی کے کنارے سرسوں کے پھول ایسی مستانہ ادا سے گھور رہے تھے کہ بلبل بھی ان سے نظر ملانے سے لجا جاتی تھی۔

ایک جانب ایک کھیت خالی پڑا تھا۔ یہ کھیت پہاڑی کے اس کنارے پر تھا۔ جس کے ایک طرف سے بدلتے زمانے کے سیاسی مطالبے نے کشادہ سڑک بنا دی تھی۔ اور تیز رفتار گاڑیاں دوڑنے لگی تھیں۔ پر دو پہر میں اور رات میں آج بھی کسی حد تک سکون ہی رہتا تھا۔ الا ماشاء اللہ۔ اس کھیت میں کسان ہل چلا رہا تھا۔ اور اس کے بچے سوکھی اور ہری گھاس اکھاڑ رہے تھے۔ کیونکہ آلو بونا تھا۔ آلو کا کھیت جتنا صاف ہو اور مٹی جتنی زیادہ جوت دی جائے، اس کی پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے۔

کسان اور مدرس میں گہرا رشتہ ہے، بیج ڈالنے سے قبل جہاں کھیت میں لمبی اور بے جا اُگی گھاس اور کھردری زمین کا صاف ہونا لازم ہے اسی طرح ایک مدرس کے فرائض میں ہے کہ وہ اپنے بچوں کے مسائل کو سمجھے اور لایعنی اور فضول باتوں سے اس کے ذہن کو پاک کر دے بلکہ کرید کر نکال دے۔ ورنہ تمام کوشش اور مخلصانہ فکر بے معنی ہوگی اور بعض وقت تو نقصان دہ۔

کسان تھوڑا استتانے کے لیے پہاڑی پر ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گیا۔ دوسری جانب آدھے کلومیٹر کی دوری پر دیکھتا ہے کہ ایک انسان ہاتھوں کے اشارے سے بلا رہا تھا۔ وہ دوڑ کر اس کے قریب گیا۔ پہچان گیا لیکن ظاہر نہیں کیا۔ وہ تو مہذب ڈاکٹر صاحب ہیں۔ وہ پانی کے لیے تڑپ رہے تھے، ان کی بیوی ایک سیٹ پر بیٹھی شدت پیاس سے بے حال تھی۔ یہ عورتوں کی ڈاکٹر تھی۔ کسان ان کے مطالبہ کو تاڑ گیا۔ اپنے بچوں کو ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔ ایک بچہ فوراً لیٹی سے بھرا پانی لایا۔ محترم اور محترمہ نے جم کر پانی پیا۔ دیہات کے کنویں کا پانی۔ بھلا اس کو فرج کا پانی کیا پا سکتا تھا۔ پھر ڈاکٹر نے عاجزی کے ساتھ اپنی گاڑی میں دھکا دینے کی بات کہی۔ وہ کسان تھا۔ دوسروں کا کام کرنا اپنا فرض اور اپنی خوبی سمجھتا تھا۔ دونوں نے گاڑی کو دھکا دیا۔ گاڑی چل پڑی۔ ڈاکٹر نے جب ہاتھ اٹھا کر Thank You کہا تو کسان سوچ میں غرق ہوگیا۔ یہ وہی مریضوں کے مسیحا ہیں جنہوں نے صرف چند بول بولنے کے ایک ہزار روپے لیے تھے۔ وہ غصہ سے بھر گیا فوراً موٹا بانس لے کر گاڑی کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ اور بولا، ایک لاکھ پانی پلانے کا اور ڈیڑھ لاکھ گاڑی میں دھکا لگانے کا۔ ڈاکٹر صاحب کانپ رہے تھے اور ڈاکٹرنی کی تو حالت بیان سے ماورا تھی۔ وہ کہے جا رہے تھے ارے بھائی انسانیت اور اقدار بھی کوئی چیز ہے۔ کسان نے گھورتی ہوئی نظروں سے کہا کیسی انسانیت اور اقدار۔ اس کے اول قاتل تم ہو۔ کسان نے غصہ سے جو کبھی کبھی لازم بھی ہے اور جز و ایمان بھی۔ ایک ایسی دنیا میں گم ہوگیا جہاں جا کر وہ بالکل بھی سنبھل نہیں پا رہا تھا، وہ کہہ رہا تھا:

''ہائے اے علم، تیرا تقدس'' کہاں......

مولانا شہباز اصلاحیؒ کا ایک اہم خط

ذیل میں سابق استاذ جامعۃ الفلاح مولانا شہباز اصلاحی مرحوم کا ایک اہم علمی خط شامل اشاعت کیا جارہا ہے، جو موصوف نے جناب مولانا امین الدین شجاع الدین مرحوم (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء) کے نام تحریر کیا تھا۔ توفیق خداوندی شامل حال رہی تو اس کالم کے تحت آئندہ بھی اہم اور نایاب خطوط کی اشاعت کا اہتمام کیا جاتا رہے گا۔ **(مدیر)**

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برادر عزیز! وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ

پھر آپ نے جوابی لفافہ بھیج دیا، افسوس کہ میں اپنے احباب کے اندر اتنا اعتماد بھی نہ بحال کرسکا کہ ساٹھ نئے پیسے خرچ کر کے جواب لکھوں گا۔ برادرم! جھیل اور دریا کی تمثیل سے دل میں طرح طرح کے خیال آنے لگے۔ یہ خیال بھی آیا کہ شاعر کو جھیل کے پانی کا ٹھہراؤ ہی نظر آیا۔ کیسی کوتاہ نظری ہے، ہر دریا کسی نہ کسی جھیل ہی سے نکلا ہے۔ گنگا کیا ہے، گنگوتری کا فیض دور تک پہنچانے کا ایک واسطہ۔ برہمپتر اور سندھ کس کو دور تک لے جاتی ہے۔ مانسرور کے پانی ہی کو تو! آہ! دنیا میں گنگا، برہمپتر اور سندھ کی دھوم ہے لیکن گنگوتری اور مانسرور ہمالیہ کی بلندیوں میں روپوش ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے عورت کی عظمت کا راز فاش کرتے ہوئے کہا ہے ؎

مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلہ سے ٹوٹا شرار افلاطوں

محراب و منبر کی اینٹوں پر سب کی نگاہ پڑتی ہے لیکن بنیاد کے اندر پوشیدہ پتھروں کو کوئی نہیں دیکھتا۔ زمزم ہی کو دیکھئے، آپ کہتے ہیں ٹھہرا ہوا ہے، وہ کہاں نہیں پہنچتا؟ دنیا کا سب سے بڑا دریا می سیسی پی ہے لیکن ایک براعظم کے اندر محدود ہے۔ زمزم کی کوئی حد نہیں۔ ایشیا، یورپ، امریکہ، آسٹریلیا تمام جگہوں تک پہنچتا ہے۔ ہر دریا صرف نشیب کی طرف جاتا ہے لیکن زمزم نشیب و فراز سے بے پروا ہر مقام پر پہنچتا

ہے۔ ہر دریا کسی بڑے دریا یا سمندر میں جا کر اپنا وجود گم کر دیتا ہے لیکن زمزم کبھی اپنی خودی پر آنچ نہیں آنے دیتا، شاعر کی نگاہ دوربین ہوتی تو وہ ٹھہراؤ کی دوررسی دیکھ لیتا۔ شاعر کا کیا قصور! آج ساری دنیا دریاؤں کو دیکھتی ہے، جھیلوں کو اہل نظر ہی دیکھتے ہیں۔

برادرم! آپ کو زمزم اور جھیل کے ذکر سے اپنی محرومیاں یاد آ گئیں۔ میں اسی ذکر سے آپ کو متوجہ کرتا ہوں کہ دریا نہ بن سکنے کا کیا غم، جھیل بن کر دریاؤں کو مالا مال کیجئے۔ کیا قلم و قرطاس ہی ایک ذریعہ ہے؟ کسی نے کہا تھا کہ ؎

درکنز وہدایہ نتواں یافت خدارا
سیپارۂ دل بیں کہ کتابے بہ ازیں نیست

ترجمہ: کنزالدقائق اور ہدایہ میں خدا نہیں مل سکتا۔ دل کا سیپارہ دیکھو کہ اس سے اچھی کوئی کتاب نہیں۔

مولانا رومؒ نے فرمایا تھا: ؎

صدکتاب وصد ورق در نارکن
سینہ را از نور حق گلنار کن

ترجمہ: سیکڑوں کتابوں اور سیکڑوں اوراق کو آگ میں ڈالو، سینہ کو حق کے نور سے روشن کرو۔

علامہ اقبالؒ نے کرم کتابی اور پروانہ کا مکالمہ نظم کیا ہے: ؎

شنیدم شبے درکتب خانۂ ما
بہ پروانہ می گفت کرم کتابی
بہ اوراق سینا نشیمن گرفتم
بسے دیدہ ام نسخۂ فاریابی
نہ فہمیدہ ام حکمت زندگی را
ہماں تیرہ روزم زبے آفتابی
چہ خوش گفت پروانۂ نیم سوزے
کہ ایں نکتہ راور کتابے نہ یابی
تپش می کند زندہ تر زندگی را
تپش می دہد بال وپر زندگی را

ترجمہ: میں نے سنا کہ ایک رات ہمارے کتب خانہ میں کرم کتابی پروانہ سے کہہ رہا تھا کہ میں نے بوعلی سینا کے اوراق میں نشیمن بنایا۔ فاریابی کے بہت سے نسخے چاٹ گیا لیکن زندگی کی حکمت اب تک نہیں سمجھ سکا۔ اب تک میرا دن بے آفتابی کی بنا پر تیرہ وتاریک ہے، ایک ادھ جلے پروانے نے کیا عمدہ بات کہی کہ یہ نکتہ تم کسی کتاب میں نہ پاؤ گے۔ تپش زندگی کو زندہ تر بناتی ہے اور تپش زندگی کو بال وپر عطا کرتی ہے۔

برادرم! اللہ کا شکرادا کیجئے کہ اس نے آپ کو دل کی تپش سے نوازا ہے ورنہ کتنے ہیں جو بقول کسے:

وگرنہ پڑھنے کو سب خاص وعام پڑتے ہیں
ہزاروں طوطے ہیں کلمہ کلام پڑھتے ہیں

کتاب خوانی کوئی بڑی چیز نہیں۔ علامہ اقبال نے طالب علم کو خطاب کر کے کہا ہے:

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

کون جانے اللہ تعالیٰ نے آپ کو کتاب سے فراغ بخش کر صاحب کتاب بنا دیا ہو۔

''المرتضیٰ'' کے تعلق سے یہ عرض کروں گا کہ اس کی تہہ کو پہنچنا سطح بینوں کا کام نہیں۔ جو لوگ عام سیرتوں اور تاریخوں کے مطالعہ کے عادی ہیں انہیں حضرت مولانا علی میاں کی کتابوں میں لطف نہیں آئے گا۔ لوگوں نے سیرت کا مقصود سمجھنے میں سخت ٹھوکر کھائی ہے اور واقعات وحوادث کے تجزیہ میں بڑی کم فہمی کا ثبوت دیا ہے۔ مہاتما گاندھی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک شخص خاص طرح کے حالات میں ایک رویہ اختیار کرتا ہے۔ بعد کو کوئی تبصرہ نگار اس کے رویہ کے مناسب ونامناسب ہونے پر تبصرہ کرتا ہے، حالانکہ وہ ان حالات کی سنگینی اور نزاکت کا پورا احاطہ نہیں کر سکتا، اس طرح ناکافی معلومات کی بنا پر کیا ہوا تبصرہ بالکل ناقص ہوتا ہے۔

حضرت مولانا، مشاجراتِ صحابہ کے بال سے باریک اور تلوار سے تیز پل صراط سے جس احتیاط اور مہارت کے ساتھ پار ہوئے ہیں وہ ان کی سلامتیِ طبع، پختگیِ فکر، مطالعہ کی گہرائی اور حسن انتخاب اور سب سے زیادہ تائید ربانی پر دلالت کرتا ہے۔ سارے صحابہ عادل ہیں اور سارے صحابہ نجوم ہدایت

ہیں۔حضرت مولانا نے ''المرتضیٰ'' میں نہایت خوبی کے ساتھ تاریخی شواہد سے ثابت کیا ہے کہ تمام خلفائے راشدینؓ نے اور حضرات حسنینؓ نے اور سارے صحابہ کرامؓ نے حسب موقع برمحل اور درست اقدام کیے۔جو کچھ فرق نظر آتا ہے وہ احوال وظروف کا فرق ہے،لوگوں کو نہیں معلوم کہ ایسے مواقع بھی آتے ہیں جہاں حالات کے تقاضے کے طور پر غلط فیصلہ کرنا ہی صحیح رویہ ہوتا ہے،آنحضورﷺ نے خود فرمایا ہے کہ دو آدمی میرے سامنے مقدمہ لاتے ہیں،ایک زبان آور ہوتا ہے،اپنا کیس اس صفائی سے رکھتا ہے کہ میں اس کے حق میں فیصلہ کر دیتا ہوں،لیکن وہ فیصلہ حقیقت کے مطابق نہیں ہوتا،فیصلہ کرنے والا اپنی معلومات اور اپنے احساسات وتأثرات کے مطابق دیانت داری کے ساتھ ایک فیصلہ کرتا ہے اور اس لحاظ سے وہ بالکل صحیح فیصلہ کرتا ہے،لیکن حقیقت نفس الامری کے لحاظ سے وہ فیصلہ صحیح نہیں ہوتا۔اس سے قاضی پر کوئی حرف نہیں آتا۔جن حالات میں جو کام حضرت عثمانؓ نے کیے ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ بعینہ انہی حالات میں حضرات شیخین وہی کام نہیں کرتے۔حضرت حسنؓ نے جن حالات میں خلافت سے دستبرداری اختیار کی،کیا وہی حالات وظروف حضرت حسینؓ کے سامنے کربلا میں تھے؟ جب احوال وظروف میں فرق تھا تو رویہ میں فرق کیوں نہ ہوتا،حضرت مولانا شاید تاریخ اسلامی کے پہلے مورخ ہیں جنہوں نے یہ نکتہ سمجھا ہے اور اسے نہایت وضاحت اور خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

دوسرے خط میں آپ نے پوچھا ہے کہ قرآن پاک میں کن کن چڑیوں کا ذکر ہے۔عرض ہے کہ قرآن میں ہابیل قابیل کے واقعہ کے ضمن میں غراب (کوا) کا ذکر ہے۔اور حضرت سلیمانؑ کے ذکر میں ہدہد کا ذکر ہے،اس کے علاوہ بہت سی جگہوں پر مطلق چڑیوں کا ذکر ہے۔شاہین کا ذکر قرآن پاک میں نہیں ہے۔عربی شاعری میں عقاب وغیرہ کا ذکر آتا ہے۔فارسی شاعری میں شہباز وشاہین کا ذکر زیادہ ہے۔شہباز کا استعارہ اچھے حوصلہ مند مومن کے لیے بعض صوفیاء کے یہاں نظر سے گزرا ہے۔مشہور ہے کہ جب مخدوم الملک حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ ابتدا میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے یہاں حاضر ہوئے تو انہوں نے فرمایا: ''شہباز بست ولے نصیب ما نیست''۔۔۔۔۔ ہے تو شہباز لیکن میرے نصیب کا نہیں ہے۔پتہ نہیں علامہ اقبال کا خیال ادھر کیوں کر گیا۔ان کی اپنی ذہنی رسائی بھی ہوسکتی ہے۔یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مغربی ادب میں کہیں سے اشارہ ملا ہو۔جو بھی ہو اقبال نے اس کو وہ عظمت اور ندرت بخشی ہے کہ شاہین ان کا امتیاز ہوگیا ہے۔

نعت رسول ﷺ

حیرت زدہ زمیں ہوئی شمس وقمر ہوئے
امی تھے وہ مگر شہ جن وبشر ہوئے

سورج سے چاند سے ہے نہ تاروں سے روشنی
روشن نبی کے نور سے دیوار ودر ہوئے

راہِ وفا میں ان کے رہے ساتھ ساتھ جو
چمکے جہاں میں صاحب فتح وظفر ہوئے

جن کو نہ راس آئی غلامی حضور کی
دنیا میں وہ جہاں بھی گئے دربدر ہوئے

جنگ وجدال صدیوں سے تھا جن کا مشغلہ
فیض رسول پاکؐ سے شیر وشکر ہوئے

وہ لوگ جو ستاتے رہے رات دن سدا
وہ بھی نبی کی رحمتوں سے بہرہ ور ہوئے

کرتے رہے جو لوگ حریفانہ کشمکش
ان کے تمام بام ودر زیر وزبر ہوئے

عارف نہ کرسکیں گے وہ سرکار سے وفا
جو بھی حریص مرتبہ وجاہ وزر ہوئے

احسان الحق عارف آئمی

منقبت حسینؓ

مجھے اس ذات سے وابستگی ہے
غلامی جس کے در کی قیصری ہے

سناں پر سر رہا ہر سر سے اونچا
عدو نے بھی تری تعظیم کی ہے

خیال عابد بیمار رکھیے
لپٹ خیموں سے پھر اٹھنے لگی ہے

دل موج فرات کربلا میں
لہو دو، پھر لہو کی تشنگی ہے

جسے سجدے کریں خنجر کے سایے
''وہ سجدہ آبروئے بندگی ہے''

مقام حضرت بزمی پہ مت جا
غلام راکب دوش نبی ہے

سید نے لگتا ہے کہ فطرت ہی بدل دی
ہر پھول مجھے خار کی صورت میں ملا ہے

سرفراز بزمی فلاحی،
سوائے مادھوپور، راجستھان

غزل

پلٹ کر دیکھنے کا مجھ میں یارا ہی نہیں تھا
نہیں ایسا کہ پھر اس نے پکارا ہی نہیں تھا
سمندر کی ہر اک شے پر ہماری دسترس تھی
کہ طغیانی بھی اپنی تھی کنارہ ہی نہیں تھا
وہ اک لمحہ سزا کاٹی گئی تھی جس کی خاطر
وہ لمحہ تو ابھی ہم نے گزارا ہی نہیں تھا
وہ بن کر چاند تب اترا تھا اس دل کی زمیں پر
محبت کا جب آنکھوں میں ستارہ ہی نہیں تھا
ورائے جسم تھا کچھ اور بھی اس کے جلو میں
فقط وہ روشنی کا استعارہ ہی نہیں تھا
جنوں کے پاؤں میں چھن کیسی درآئی کہ میں نے
ابھی وحشت کو سینے میں اتارا ہی نہیں تھا

ارشد جمال صارمؔ،
منصورہ طبیہ کالج، مالیگاوں

غزل

نفرت کا گرم چار سو بازار ہوگیا
جینا وطن میں اب بڑا دشوار ہوگیا

ہم نے بنایا تھا جو محل پیار کا یہاں
نفرت کے زلزلوں میں وہ مسمار ہوگیا

اہل وفا کو طعنے ملے بے وفائی کے
مسند نشین دیش کا غدار ہوگیا

کرتوت سارے چھپ گئے سیوا کی آڑ میں
''بابا'' کو جیل بھیجنا دشوار ہو گیا

بیوی کو چھوڑ کر وہ شہنشاہ بن گئے
میں نے طلاق دی تو گنہگار ہوگیا

سینچا تھا میں نے خون سے اپنا چمن ضیا
میرا نصیب گل کے عوض خار ہوگیا

ڈاکٹر ضیاء الرحمن ضیا فلاحی،
شانتاپرم۔کیرلا

تعارف وتبصرہ

آدی باسی سماج اور مسلمان

مصنف:محمد اقبال ملاّ

اشاعت: نومبر۲۰۱۵ء، **صفحات**:۴۸،**قیمت**: ۲۵/-روپیہ

ملنے کا پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی

مبصر : محمد اسعد فلاحی ،نئی دہلی

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں انسان کو پیدا کیا، اسے اشرف المخلوقات بنایا، اپنا خلیفہ ونائب مقرر کیا اوراس پر بے شمار انعامات واحسانات کیے۔اس نے انسان کواس دنیا میں یوں ہی بے کار نہیں چھوڑ دیا، بلکہ اس کی ہدایت ورہنمائی کے لیے دنیا کے ہر خطہ میں اپنے رسولوں کو بھیجا۔سب سے آخر میں حضرت محمد ﷺ تشریف لائے۔اب آپؐ کے بعد قیامت تک کوئی نبی یا رسول نہیں آئے گا۔اب اللہ تعالیٰ نے اس پیغام کو پوری انسانیت تک پہنچانے کی ذمہ داری امت مسلمہ پر عائد کی ہے۔

ہندوستان میں انسانوں کی ایک بڑی آبادی آدی باسی کے نام سے جانی جاتی ہے۔یہ لوگ قبائلی زندگی گزارتے ہیں۔عموماً تہذیب وتمدن سے ناآشنا ہیں۔ان تک بھی اسلام کا پیغام پہنچانا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔اگر انھوں نے اس معاملہ میں کوتاہی کی تو بارگاہ الٰہی میں جواب دہ ہوں گے۔زیرنظر کتاب میں اسی نکتے پر بحث کی گئی ہے۔

کتاب کوسات(۷)ابواب میں تقسیم کیا ہے۔پہلے باب میں مصنف نے آدی باسیوں کی پہچان، ان کی آمد، دوسرے قبائل کے ساتھ ان کی جدوجہد اوران کی دستوری حیثیت پر گفتگو کی ہے۔دوسرے باب میں آدی باسیوں میں فریضۂ دعوت کی ضرورت واہمیت،ان کی خصوصیات،ان کے سماج کی موجودہ صورت حال،کاردعوت کے امتیازات،انبیاء کا نمونہ اوردعوت سب انسانوں کے لیے، جیسے موضوعات کا احاطہ کیا ہے۔میدان دعوت کے مسائل اور ان کا حل،آدی باسیوں میں دعوت کی راہ میں پیش آنے

والے مسائل کا عمومی تجزیہ کیا گیا ہے۔ان مسائل میں آدی باسیوں کی زبان سے عدم واقفیت، مسلمانوں کی بے عملی اور غیر اسلامی طرز زندگی، وسائل کی کمی، اجنبیت اور دوری، بعض عناصر کی طرف سے مخالفت اور لٹریچر کی کمی کا تذکرہ کیا ہے۔ چوتھے باب میں آدی باسی تحریکات (سن پال تحریک، منڈا تحریک، بوڈو تحریک، گونڈوانہ تحریک اور تانا بھگت تحریک) کا تذکرہ کیا گیا ہے۔اس میں سے دو بڑی تحریکوں (برسا منڈا تحریک اور تانا بھگت تحریک) کا مختصر تعارف بھی کرایا گیا ہے۔آخری دو ابواب میں مصنف نے اپنے دعوتی تجربات کی روشنی میں داعیان حق کو آدی باسیوں میں کار دعوت انجام دینے کے لیے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا ہے۔مثلاً ان سے مسلسل ربط قائم کرنا، ان کے خلاف ہورہے مظالم کے خلاف آواز بلند کرنا، ان کے مسائل کے حل کے لیے اجتماعی پلیٹ فارم قائم کرنا، تعلیم کے فروغ کے سلسلے میں اقدامات کرنا، ان کی قانونی رہنمائی کرنا، ان کے لیے لائبریری قائم کرنا، طب وحفظان صحت اور اسی طرح کی دیگر سرگرمیاں۔ کتاب کے آخر میں دو ضمیمہ بھی شامل کیے گئے ہیں۔جن میں آدی باسیوں کی شرح آبادی صوبوں کے اعتبار سے بتائی گئی ہے۔

اس کتاب کے مصنف جناب محمد اقبال ملا، مرکز جماعت اسلامی ہند میں شعبۂ دعوت کے سکریٹری ہیں۔موصوف تحریر وتصنیف کا عمدہ ذوق رکھتے ہیں۔دعوتی موضوعات پر ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔مثلاً دعوتی کاموں کے لیے خطوط کار، جذبۂ دعوت کی آبیاری، وحدت ادیان کی حقیقت، حق کی تلاش، دعوت دین کی منصوبہ بندی وغیرہ۔ زیر نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔کتاب اپنے موضوع پر ایک عمدہ کاوش ہے، خاص طور پر ان داعی حضرات کے لیے ایک بیش قیمت تحفہ ہے، جو ہندوستان میں دلتوں، آدی باسیوں اور نکسلیوں میں دعوت حق کو عام کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔

جامعہ کے لیل ونہار

مصباح الباری فلاحی، استاذ شعبہ اعلی، جامعۃ الفلاح

ایس آئی او کی جانب سے تعلیمی بیداری مہم

۳رستمبر ۲۰۱۸ء بروز دوشنبہ ابواللیث ہال میں ایس آئی او آف انڈیا کے مرکزی ذمہ داران کی آمد پر خصوصی پروگرام کا انعقاد

برادر جسیم (کیمپس سکریٹری ایس آئی او آف انڈیا) نے اپنی گفتگو میں حالات حاضرہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ مسلمانوں کے خلاف کس کس طرح کی پلاننگ ہورہی ہے اس پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ تعلیم حاصل کرنے کا حق جتنا ہمارا ہے اتنا ہی دوسروں کا بھی ہے، لیکن سماج میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو نفرت کا کاروبار کررہے ہیں اور تعلیم کے حصول کا حق صرف اپنی ذات اور برادری تک محدود رکھتے ہیں۔ برادر جسیم نے مسلمانوں میں اعلی تعلیم کے تناسب پر بھی اچھی گفتگو کی۔

برادر مسیح الزماں لاری نے اپنی گفتگو میں فرمایا کہ اسلام انصاف چاہتا ہے لیکن یہ انصاف کون کرے گا۔ اس ملک میں جو بھی سرکاریں بنی ہیں انہوں نے نصاب تعلیم میں دھیرے دھیرے تبدیلی کی ہے۔ ہندوستان میں مختلف مذاہب پائے جاتے ہیں، پہلے نصاب میں مختلف مذاہب کی چیزیں داخل تھیں، ہر مذہب کے لوگوں کو معلوم ہوتا تھا کہ پیغمبر اسلام کون تھے؟ لیکن آج ان ساری چیزوں کو نصاب سے باہر کردیا گیا ہے لیکن اس پر آواز کون اٹھائے گا! ہندوستان کا قانون اور دستور ہمیں سوال کرنے کی اجازت دیتا ہے، چنانچہ ہمیں حکومت سے سوال کرنا چاہیے کہ دنگا کرنے والے اور سماج میں نفرت پھیلانے والے لو محفوظ ہیں جبکہ نجیب، اخلاق اور دوسرے بے قصور محفوظ نہیں رہ سکے۔

اس پروگرام کی نظامت برادر محمد اشہد (فضیلت سال دوم) نے انجام دی۔ اس پروگرام میں شعبہ اعلی کے تمام ہی طلبہ واساتذہ کرام نے شرکت کی۔

قائم مقام نگران اعلیٰ جناب مولانا اظہار احمد فلاحی کا طلبہ سے خطاب

۵ رستمبر ۲۰۱۸ء بروز چہارشنبہ بعد نماز عشاء جامعہ کی مسجد میں قائم مقام نگران اعلی مولانا اظہار احمد فلاحی صاحب نے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آپ لوگ وقت کی قدر کریں، جامعہ کے اصول وضوابط اور ڈسپلن کی پابندی کریں، نمازوں کا اہتمام کریں، وقت پر کلاس پہنچیں، جامعہ کی لائبریری سے بھرپور استفادہ کریں اور ہمارے ساتھ ہر ممکن تعاون کی کوشش کریں۔ آپ نے اس موقع پر جامعہ کے اصول وضوابط اور ڈسپلن کی تفہیم بھی کرائی گئی۔ اسی طرح موصوف نے فضیلت کے طلبہ، طیبہ منزل کے طلبہ اور قرب وجوار کے طلبہ کو بھی خطاب کیا۔

ناظم جامعہ کا طلبہ سے خطاب

۹ رستمبر ۲۰۱۸ء بروز شنبہ ابواللیث ہال میں ناظم جامعہ جناب مولانا رحمت اللہ اثری صاحب نے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ جامعہ میں ماحول سازی کا کام تمام ہی طلبہ اور اساتذہ کو مل کر کرنا ہوگا، اس کے لیے ہر فرد اپنے آپ کو آمادہ کرے، سلام کو خوب خوب رواج دیجئے، یہ ہمارے ماحول کا امتیازی پہلو ہے۔ دوسری بات یہ کہ آپ یہاں پڑھنے آئے ہیں اس لیے خوب خوب محنت کیجئے، وقت کی قدر کیجئے اور اس کا صحیح صحیح استعمال کیجئے، مسجد کا احترام کیجئے، یہاں بیٹھ کر گپ شپ بالکل نہ کیجئے۔ اپنے اساتذہ کرام کا ادب واحترام کیجئے۔ اٹھنے بیٹھے، رہنے سہنے اور چلنے پھرنے ہر چیز کا سلیقہ سیکھئے۔ آپ میں سے ہر فرد ایک مثالی طالب علم بننے کی کوشش کرے۔ اس کے علاوہ ناظم جامعہ نے خطاب کے بعد فضیلت کے طلبہ کے ساتھ خصوصی نشست کا بھی اہتمام کیا۔

مولانا سید ابوالاعلی مودودی ریسرچ سینٹر کی جانب سے تقسیم انعامات

۱۱ رستمبر ۲۰۱۸ء بروز سہ شنبہ ابواللیث ہال میں مولانا سید ابوالاعلی مودودی ریسرچ سینٹر کی جانب سے تقسیم انعامات کی تقریب منعقد ہوئی۔ محمد توقیر (عربی پنجم) کی تلاوت سے پروگرام کا آغاز ہوا۔ افتتاحی کلمات میں مولانا انیس احمد فلاحی مدنی صاحب (صدر شعبہ اعلی) نے فرمایا کہ طلبہ کے لیے یہ مسابقہ کا دور ہے لیکن اس دور میں طلبہ مسابقوں میں شرکت نہیں کرتے، یہ بڑے افسوس کا مقام ہے، اس لیے طلبہ ہر مسابقہ میں شرکت کریں۔

مولانا سید ابوالاعلی مودودی ریسرچ سینٹر کے روح ورواں جناب سکندر علی اصلاحی صاحب نے اپنی گفتگو میں فرمایا کہ ہم نے مختلف مدارس میں مسابقے منعقد کیے ہیں اور اسی طرح طلبہ وطالبات میں بھی مسابقے منعقد کرتے ہیں۔ایک ہزار سات سوانتیس لوگوں نے پورے ملک سے ہم سے رابطہ کیا اس مسابقہ میں شرکت کے لیے۔اسی طرح تین سوسولہ افراد ہم سے مسلسل رابطہ میں رہے۔اسی طرح اسی، چوراسی اور چوہتر سال کی عمر کے لوگوں نے بھی اس مسابقہ میں شرکت کی ہے۔اسی طرح اس مسابقہ میں شریک کل تعداد دوسواٹھاون رہی، جن کی کاپیاں ہمارے پاس پہنچیں۔اس وقت طلبہ کو جو موقع میسر ہے یہ موقع بعد میں نہیں ملے گا۔یہ وقت بہت ہی قیمتی ہے اس کو ضائع نہ کریں، ہم نصابی کتابوں کے مطالعہ کا بھی اہتمام کریں۔تقریر وتحریر کی خوب خوب مشق کریں۔یہ تحریک اسلامی کا ادارہ ہے اور یہاں کے طلبہ سے دنیا نے بہت امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔

اس مسابقہ میں شریک تین طلبہ محمد تنویر، محمد اسعد اور محمد اشرف کو اس موقع پر انعامات سے نوازا گیا۔ اسی طرح اس مسابقہ میں ۲۱؍طالبات نے بھی شرکت کی، شریک طالبات کو کلیۃ البنات میں انعامات سے نوازا گیا۔نظامت کے فرائض مولانا ذکی الرحمٰن غازی صاحب نے انجام دیے۔

جمعیۃ الطلبہ کی جانب سے ادبی نشست کا انعقاد

۲۰؍ستمبر بروز پنج شنبہ بعد نماز مغرب جمعیۃ الطلبہ کی جانب سے ایک ادبی نشست کا انعقاد ابواللیث ہال میں ہوا۔اس نشست میں متعدد طلبہ نے اپنی اپنی تخلیقات پیش کیں۔

جمعیۃ الطلبہ کے نئے سکریٹری کا انتخاب

۲۰؍ستمبر ۲۰۱۸ء بروز پنج شنبہ ابواللیث ہال میں انعام الرحمٰن (مہاراشٹر، عربی ششم) کو کثرت رائے سے اس سال کا نیا سکریٹری منتخب کیا گیا، کیونکہ اس سے پہلے سکریٹری محمد عاصم نے اپنی کچھ مجبوریوں اور دشواریوں کی وجہ سے استعفیٰ دے دیا تھا۔

انجمن طلبہ قدیم بلریا گنج یونٹ کی نشست

۷ر ستمبر ۲۰۱۸ء بروز جمعہ بعد نماز جمعہ ابواللیث ہال میں انجمن طلبہ قدیم بلریا گنج یونٹ کی جانب سے ایک پروگرام منعقد ہوا۔ اس پروگرام میں بلریا گنج اور شہاب الدین پور کے لوگوں کو خصوصی طور پر مدعو کیا گیا۔ تقریباً ڈیڑھ سو افراد نے اس پروگرام میں شرکت کی۔ تلاوت قرآن اور ترانہ جامعہ کے بعد افتتاحی کلمات محمد فیضان فلاحی صاحب (صدر یونٹ بلریا گنج) نے پیش کیے۔ خصوصی خطاب میں ناظم جامعہ جناب مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی مدنی صاحب نے فرمایا کہ ۱۹۱۴ء میں جامعۃ الفلاح ایک مکتب کی شکل میں وجود میں آیا پھر مختلف لوگوں کی محنت اور کوشش رنگ لائی اور یہ ادارہ آج اس شکل میں موجود ہے۔ آج مسلمان تعلیم کے میدان میں پیچھے ہیں۔ پسماندہ ہیں۔ انگریز ہندوستان آئے اور مسلمانوں کے خلاف پورا زور صرف کر دیا، لیکن پھر حالات ایسے آئے کہ انگریزوں کو جانا پڑا لیکن وہ ایسا کر گئے کہ مسلمان پیچھے ہوتے چلے گئے۔

جامعۃ الفلاح کی ترقی میں بلریا گنج کے لوگوں کی بہت ہی اہم قربانیاں ہیں۔ دیوبند، ندوہ، اصلاح اور سلفیہ کو عالمی شہرت حاصل ہے لیکن جامعۃ الفلاح کو اس لیے شہرت حاصل ہے کہ یہاں طلبہ کے ساتھ ساتھ طالبات کی یکساں تعلیم کا مکمل نظم ہے۔ اس ادارہ کی دوسری خصوصیت و خوبی یہ ہے کہ مسلکی، گروہی، اور فقہی عصبیت سے یہ ادارہ پاک ہے۔ جامعہ کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ ابتدائی درجات کے بعد ثانوی درجات ہیں جبکہ دیگر اداروں میں ابتدائی کے بعد طلبہ عربی درجات میں چلے جاتے ہیں۔

مولانا نے فرمایا کہ ہم سب اس ادارہ کی پیداوار ہیں۔ جس نے ایک دو سال یہاں تعلیم حاصل کی ہے وہ بھی اس میں شامل ہیں۔ یہ ہماری مادر علمی ہے اس لیے ہم اس جامعہ کے بارے میں سوچیں۔ آپس میں ہمارا اختلاف ہونا فطری بات ہے لیکن یہ ادارہ ہم سب کا ہے، اسکے لیے ہم سب نے اپنا خون و پسینہ ایک کیا ہے۔ بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں۔ اس لیے جامعہ کو ترقی دینا ہم سب کا مطمح نظر ہونا چاہیے۔ اس علاقہ کے ہر گھر کی عورت اور بچیاں اس ادارہ کی پروڈکٹ ہیں۔ جس سے ماحول

میں کافی بدلاؤ آیا ہے۔ یہاں کی بچیاں جہاں بھی گئیں وہاں کے ماحول میں کافی تبدیلی آئی ہے۔ یہ سب اس ادارہ کی دین ہے۔ ہمارے پاس اس کی مثالیں موجود ہیں۔

جب جامعہ کی ذمہ داری مجھ جیسے ناتواں شخص پر پڑی تو میں نے سوچا کہ جامعہ میں تعمیراتی کام تو کافی بڑھ چکے ہیں اب پوری توجہ تعلیم پر دی جائے۔ چنانچہ اس لیے آپ کی توجہ اور تعاون کی بھی اشد ضرورت پڑے گی۔ ہم جس قدر اپنے بچوں پر توجہ دیں گے اسی کے بقدر ہمیں فائدہ پہنچے گا۔

جب بزرگ، نوجوان، اور بچے کوئی کام ایک ساتھ کرتے ہیں تو بزرگوں کا تجربہ، نوجوانوں کی جوانی اور بچوں کی دعا کام آتی ہے۔ اس لیے تینوں کا اجتماع نہایت ضروری ہے۔ تاکہ جامعہ ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکے۔

اس ادارہ کو ترقی دینے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کا تعاون ہمارے ساتھ رہے۔ بچوں کی صحیح نہج پر تربیت کریں۔ آپ جب چاہیے ہمارے پاس آ سکتے ہیں۔ آپ کے مشوروں کے ہم متمنی ہیں۔ بلا جھجھک آپ مل سکتے ہیں آپ کی ہر اہم بات اور مشورہ قابل عمل ہوگا۔

اختتامی کلمات میں جناب مولانا امیر فیصل فلاحی صاحب نے پیش کیے۔ آپ نے تمام شرکاء کا شکریہ ادا کیا اور یہ بھی فرمایا کہ اپنے بچوں کی تربیت پر پوری توجہ دیں۔ اس پروگرام میں نظامت کے فرائض محمد عاطف فہد، عبدالمنان متکلم فضیلت سال دوم نے انجام دیے۔ پروگرام کے اختتام پر عصرانہ کا بھی اہتمام کیا گیا۔